خلافت کی حقیقت

اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعات
تحریک خلافت پاکستان

خلافت کی حقیقت

اور

عصرِ حاضر میں اس کا نظام

ڈاکٹر اسرار احمد

بانی تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان
و صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 5969501-03

نام کتاب ——— خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام
طبع اوّل تا چہارم (اکتوبر 1996ء تا جنوری 2005ء) ——— 6600
طبع پنجم (اپریل 2006ء) ——— 1100
ناشر ——— ناظم نشر و اشاعت مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
مقام اشاعت ——— 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون 5869501-03
مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور
قیمت (اشاعت خاص) ——— 120 روپے
(اشاعت عام) ——— 60 روپے

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

ترتیب

تقدیم —— 9

خطبہ اول

عالمی خلافت کی نوید —— 15

خطبہ ثانی

عہد حاضر میں نظام خلافت کا سیاسی ڈھانچہ —— 71

خطبہ ثالث

عہد حاضر میں نظام خلافت کا معاشی و معاشرتی ڈھانچہ —— 115

خطبہ رابع

قیام خلافت کا نبوی طریق —— 155

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

سلطنت خداداد پاکستان میں نظام خلافت کے قیام کے لئے "تحریک خلافت پاکستان" کا آغاز راقم الحروف نے ستمبر ۱۹۹۱ء کو کراچی پریس کلب میں اپنی ایک پریس کانفرنس سے کیا تھا۔ وہاں جو تحریری بیان بھی تقسیم کیا گیا تھا وہ اس کے بعد "پاکستان میں نظام خلافت' کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟" کے عنوان سے لاکھوں کی تعداد میں طبع ہو کر تقسیم ہو چکا ہے۔

عربی زبان کے متفق مقولے یعنی: "الفضل للمتقدم" اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک: "من لم یشکر الناس لا یشکر اللّٰہ" کے مطابق لازم ہے کہ قیام نظام اسلامی کے لئے اپنی تیس سالہ جدوجہد کے ہدف کے لئے اس عنوان کے اختیار کرنے میں مجھے جن حلقوں سے رہنمائی ملی ان کا حق شکر ادا کیا جائے۔

پاکستان میں اگرچہ اس سے قبل بھی بعض حضرات خلافت کے عنوان سے کام کر رہے تھے اور ایک موقع پر اس کا ایک اجتماعی نظم بھی قائم ہوا تھا جس کے ایک اجلاس میں راقم کو بھی شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ لیکن افسوس کہ میرے گمان کے مطابق ان حضرات کے سامنے نہ کوئی واضح تصورات تھے نہ معین لائحہ عمل۔

میں نے سب سے پہلے جو تاثر لیا وہ "حزب التحریر" سے تھا جو اولاً تو فلسطینی اور اردنی عربوں کی تحریک تھی لیکن انگلستان اور امریکہ میں ان کے زیر اثر ہندو پاک کے بھی بہت سے مخلص اور جوش و جذبے سے سرشار نوجوان متحرک ہو گئے تھے۔ اس جماعت نے خاصا لٹریچر بھی خلافت کے متعلق اپنے تصورات و نظریات پر مشتمل شائع کیا۔ لیکن میں جہاں ان کے جذبہ عمل سے تو بہت متاثر ہوا وہاں ان کے بہت سے نظریات سے اتفاق نہ کر سکا۔ تاہم یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ ہمیں اپنے احیاء اسلام کے جہاد کے دعوے کی

"ہدف" کے طور پر "خلافت" کی اصطلاح استعمال کرنی چاہئے۔ ("حزب التحریر" کی مشہور زمانہ "خلافت کانفرنس" جو اوائل اگست ۱۹۹۴ء میں ویمبلے ایرینا' لندن میں ہوئی تھی' اس میں ان کی دعوت پر راقم نے بھی شرکت کی تھی اور عالمی میڈیا نے بھی میری تقریر کو بہت اہمیت دی تھی۔ چنانچہ اسی کے نتیجے میں مجھے روتی ایئرپورٹ سے واپس کر دیا گیا تھا۔)

اسی دوران میں کراچی میں ایک صاحب راؤ اسید علی خان مجھ سے ملنے آئے۔ وہ پاکستان ایئرفورس کے ونگ کمانڈر رہے تھے لیکن ۱۹۷۱ء میں پاکستان کی ذلت آمیز ہزیمت سے بددل ہونے کے باعث قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر امریکہ منتقل ہو گئے تھے۔ جہاں ان کے بیان کے مطابق کچھ لوگوں نے اپنے اوپر یہ رضاکارانہ ذمہ داری عائد کر لی تھی کہ وہ یہودیوں کے عزائم اور منصوبوں سے آگاہی حاصل کرتے رہیں اور پھر ان کے سدباب کے ضمن میں مشورے عالم اسلام کی حکومتوں اور اہم اشخاص کو دیتے رہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک یہودیوں کی سازشوں کا واحد توڑ یہ ہے کہ عالم اسلام میں بالعموم اور ارض پاکستان میں بالخصوص قیام خلافت کی تحریک چلائی جائے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں از خود بھی اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ ایک مشترکہ پریس کانفرنس میں اس کا اعلان کیا جائے۔ چنانچہ اس کے لئے متذکرہ بالا بیان بالاتفاق مرتب ہوا۔ لیکن میری اقامت گاہ سے واپس گھر پہنچتے ہی انہوں نے فون کر دیا کہ وہ پریس کانفرنس میں شریک نہیں ہوں گے۔ اس پر میں نے اللہ پر توکل کرتے ہوئے اپنے طور پر ہی پریس کانفرنس سے خطاب کیا اور تحریک کے آغاز کا اعلان کر دیا۔ تاہم ان کا تذکرہ بھی یہاں اس شعر کے مصداق کر دیا گیا ہے کہ ؎

تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے!

میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ اگرچہ مجھے احیائے اسلام کا ایک مبہم جذبہ تو اولاً علامہ اقبال کی ملی شاعری سے ملا تھا۔ لیکن اس خاکے میں تحریک اور اس کے لوازم و خدوخال کا

رنگ مولانا مودودی کی تحریروں کے ذریعے ابھرا گیا۔ مولانا مرحوم نے جماعت اسلامی کی تاسیس کے موقع پر اپنے "نصب العین" کی تعبیر "حکومت الٰہیہ" کی اسی اصطلاح سے کی تھی جس کا استعمال اولاً مولانا ابوالکلام آزاد --- اور پھر ان کے بعد خیری برادران اور علامہ مشرقی نے کیا تھا ---- لیکن بعد ازاں جب جماعت اسلامی میں مولانا امین احسن اصلاحی کی شمولیت کے بعد ان کے قرآنی فکر کا دھارا بھی مولانا مودودی کے افکار کے دھارے میں شامل ہو گیا تو اس وقت اس کی تعبیر کے لئے خالص قرآنی اصطلاحات یعنی "شہادت علی الناس" --- "فریضہ اقامت دین" اور "غلبۂ دین حق" کا استعمال عام ہو گیا۔

چنانچہ جب خود میں نے ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے کے بعد ۱۹۶۵ء میں اپنی ذاتی مساعی کا آغاز کیا تو ان ہی اصطلاحات کو نہ صرف اپنایا بلکہ اپنی بساط بھر مزید مدلل اور مبرہن بھی کیا۔ اور مزید برآں "جہاد فی سبیل اللہ" کے فرض عین ہونے پر قرآن و سنت سے بھرپور استدلال قائم کیا اور اس کے مراحل و لوازم کے پورے نقشے کو بھی سیرت النبی ﷺ سے اخذ کر کے دکھا دیا ---- تاہم یہ احساس ضرور رہا کہ ان ثقیل اصطلاحات سے پڑھا لکھا طبقہ تو قدرے قلیل محنت سے مانوس ہو بھی سکتا ہے' لیکن عوام الناس کے ذہن و قلب تک ان کے ذریعے رسائی ممکن نہیں ہے۔ میں اسی حیص بیص میں تھا کہ متذکرہ بالا حلقوں کے ذریعے "خلافت" کی اصطلاح کی جانب ذہن منتقل ہوا۔ اور اس کے ساتھ اس حقیقت کی جانب بھی توجہ ہوئی کہ "خلافت راشدہ" کی تابناک یاد پوری نوع انسانی کے اجتماعی تحت الشعور میں ایک حسین خواب کی مانند ثبت ہے' لہٰذا اس کے ذریعے عوام و خواص دونوں کے قلوب و اذہان تک بآسانی رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے لئے "تحریک خلافت پاکستان" کے عنوان سے ایک ادارہ باقاعدہ رجسٹر کرا کے اس کے تحت کام شروع کر دیا!

اس کے بعد سے اب تک جو محنت میں خود اور میری جماعت یعنی "تنظیم اسلامی"

اس ضمن میں کر سکی ہے اس کا اصل حاصل تو یہ ہے کہ اب بحمد اللہ پاکستان کے دینی شعور کے حامل جملہ حلقوں میں یہ تحریک متعارف ہو چکی ہے اور سب جانتے ہیں کہ جیسے تحریک پاکستان کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت کا نام "مسلم لیگ" تھا ایسے ہی "تحریک خلافت پاکستان" کے لئے عملی کوشش کرنے والی جماعت کا نام "تنظیم اسلامی" ہے! اور اب "خلافت" کے عنوان سے پاکستان اور بیرون پاکستان ایک ہی ادارہ جانا اور پہچانا جاتا ہے اور وہ ہے "تحریک خلافت پاکستان"! جس کے داعی کی حیثیت اس خاکسار کو حاصل ہے!!

یہ نتیجہ ظاہر ہے کہ تنظیم اسلامی کے جملہ رفقاء و کارکنان اور تحریک خلافت کے تمام ارکان و معاونین کے ایثار مالی اور بذل نفس ہی سے برآمد ہوا ہے۔ تاہم اس میں میری "ذاتی مساعی" دو اہم صورتوں میں سامنے آئیں جو اپنی پیرانہ سالی اور معذوری کے درجہ تک پہنچ جانے والی علالت کے پیش نظر اللہ کے خصوصی فضل و کرم اور تائید و توفیق ہی کی مظہر قرار دی جاسکتی ہیں:

ایک' پورے پاکستان کا مفصل دورہ جس کے دوران لاہور' فیصل آباد' سرگودھا' میانوالی' ڈیرہ اسماعیل خان' بنوں' پشاور' راولپنڈی' گجرات' گوجرانوالہ' سیالکوٹ' رحیم یار خان' کوئٹہ اور کراچی میں کھلے میدان میں عوامی جلسے منعقد کئے گئے' جن میں میں نے دو دو اور اڑھائی اڑھائی گھنٹے کی تقاریر کھڑے ہو کر پورے جوش خطابت کے ساتھ کیں (جس کے نتیجے میں میرے گھٹنے جو پہلے ہی متاثر تھے' بالکل جواب دے گئے!) تاہم میں اپنے اس "ایثار جسم و جان" کو اپنے لئے موجب سعادت یقین کرتا ہوں!! چنانچہ بعد میں' میں ایک جانب مردان' دیر' ایبٹ آباد اور ہری پور میں اور دوسری جانب جہلم و پنڈی گھیب اور مظفر آباد و دھیرکوٹ میں' اور تیسری جانب ساہیوال' ملتان' خانیوال' بورے والا اور حیدر آباد سندھ میں ان جلسوں سے خطاب کرسی پر بیٹھ کر ہی کرسکا۔

اور دوسری' پاکستان کے بڑے بڑے ثقافتی مراکز میں ہالوں اور آڈیٹوریموں کی مسقف چار دیواری میں محصور پرسکون ماحول میں "خطبات خلافت" کی صورت میں خالص علمی اور عقلی استدلال کے ساتھ نظام خلافت سے متعلق ان جملہ مسائل و مشکلات

کے حل کی کوشش جو بالعموم نہ صرف مخالفین بلکہ موافقین کے ذہنوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

ان بالعموم چار اور کہیں کہیں تین روزہ خطبات کا آغاز کراچی کے خالق دینا ہال سے ہوا تھا۔ جہاں اس صدی کے اوائل میں "تحریک خلافت" کے قائدین کے خلاف بغاوت کے مقدمے کی سماعت ہوئی تھی۔ گویا اس کاروان کے از سر نو سفر کا آغاز اسی مقام سے ہوا جہاں پر اس کی پیش رفت کو روک دیا گیا تھا...... اور اختتام لاہور میں ہوا، جہاں ۱۹۴۰ء میں "قرارداد پاکستان" منظور کی گئی تھی۔

کراچی اور لاہور کے علاوہ یہ خطبات راولپنڈی، پشاور، کوئٹہ اور ملتان میں بھی دیئے گئے تھے، تاہم پیش نظر کتاب کی ترتیب میں متن کے لئے ان کے آخری version یعنی جناح ہال لاہور کے خطبات کو ٹیپ سے اتار کر اور غیر ضروری تکررات کو حذف کر کے مرتب کیا گیا ہے۔

ذاتی طور پر مجھے ان پر نظر ثانی کی مہلت حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ لہٰذا انہیں اصلاً اہل علم اور اصحاب دانش کی خدمت میں "عرضداشت بغرض استصواب" سمجھنا چاہئے۔ میں ان تمام بزرگوں اور عزیزوں کا صد درجہ ممنون احسان ہوں گا جو ان کے ضمن میں میرے فکر کی کجی یا آراء کی غلطی کو واضح کریں۔ اور اللہ کو گواہ بنا کر وعدہ کرتا ہوں کہ انکے تبصروں اور تجویزوں پر پوری توجہ کے ساتھ غور کروں گا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میری اس سعی کو شرف قبول عطا فرمائے اور اس سلطنت خداداد پاکستان میں "خلافت علی منہاج النبوت" کے نظام کے قیام کو، جو نبی اکرم ﷺ کی "رحمۃ للعالمین" کا سب سے بڑا مظہر ہے، دنیا بھر میں قائم و نافذ کرنے کے لئے نقطۂ آغاز بنانے کی جدوجہد کی تمہید بنا دے۔ وما ذٰلک علی اللّٰہ بعزیز!!

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ
داعی تحریک خلافت پاکستان

لاہور — ۲/اکتوبر ۱۹۹۲ء

1

خطبہ اول

عالمی خلافت

کی نوید

ذیلی عنوانات

- ○ آیۂ استخلاف کا اجمالی تعارف
- ○ فسق اور کفر کی حقیقت
- ○ سورۂ صف کی آیات (۸ - ۱۴) کا اجمالی تعارف
- ○ نورِ خدا کے دشمن؟
- ○ رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت
- ○ غلبۂ دین اور جہاد و قتال
- ○ دنیوی اور اخروی وعدے
- ○ وعدۂ استخلاف کی تکمیلِ اول
- ○ قافلہ سخت جاں ' منزل بمنزل
- ○ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ
- ○ ظالم ملوکیت کا دور
- ○ جبر مبنی ملوکیت
- ○ بالواسطہ غلامی کا دور
- ○ دورِ سعادت کی نوید جاں فزا
- ○ بیسویں صدی کی تاریخی اہمیت
- ○ اہلِ ایمان کا طلوع و غروب
- ○ عالمی خلافت
- ○ غلبۂ دین اور احادیث مبارکہ
- ○ فلسفۂ ارتقاء اور غلبۂ دین
- ○ New World Order سے نظامِ خلافت تک
- ○ دورِ سعادت سے پہلے
- ○ بنی اسرائیل کے عذابِ استیصال میں تاخیر کی وجہ
- ○ امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کی تاریخ
- ○ آنے والے عذاب کی جھلک
- ○ نزولِ مسیحؑ اور خروجِ دجال
- ○ پاکستان میں خلافت کا احیاء
- ○ بھارت میں ہندومت کا احیاء
- ○ نظامِ خلافت کب اور کہاں برپا ہوگا؟
- ○ حادثات اور واقعات کا ظاہر و باطن
- ○ یہود کے خواب اور ان کی تعبیر

آیۂ استخلاف کا اجمالی تعارف

میں نے اپنے خطاب کے شروع میں جو آیات مبارکہ تلاوت کی ہیں ان میں سے پہلی سورۂ نور کی آیت ۵۵ میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ
وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ
بِيْ شَيْــــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾

(النور : ۵۵)

"وعدہ کر لیا ہے اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے ہیں اور کئے ہیں انہوں نے نیک کام' البتہ پیچھے حاکم کر دے گا ان کو ملک میں جیسا حاکم کیا تھا ان سے اگلوں کو اور جما دے گا ان کے لئے دین ان کا جو پسند کر دیا ان کے واسطے اور دے گا ان کو ان کے ڈر کے بدلے میں امن۔ میری بندگی کریں گے' شریک نہ کریں گے میرا کسی کو اور جو کوئی ناشکری کرے گا اس کے پیچھے' سو وہی لوگ ہیں نافرمان"۔

اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کرنے والے مسلمانوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کو زمین میں ضرور خلافت عطا فرمائے گا۔ یہاں پر خلافت سے مراد مسلمانوں کی حکومت ہے۔

اس وعدے کے سلسلہ میں مزید وضاحت یہ فرما دی کہ یہ خلافت یا حکومت موجودہ

امت مسلمہ (جو امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے) کو اسی طرح عطا کی جائے گی جس طرح اس سے پہلے کی امت مسلمہ (بنی اسرائیل) کو عطا کی گئی تھی۔ [۱]

اس آیت میں اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ہم نے اس سابقہ امت کو بھی حکومت عطا کی تھی، چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ﴾

"اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ [۲] بنایا"۔

گویا تاریخ کے حوالے سے بتایا جا رہا ہے کہ اے امت مسلمہ! تم میں سے جو لوگ ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کر دیں گے ہم انہیں لازماً خلافت عطا کریں گے جس طرح تم سے پہلوں کو عطا کی تھی۔

آیہ مبارکہ کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات نوٹ کر لی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جو وعدہ فرمایا ہے اس کے لئے عربی زبان میں تاکید کا جو سب سے زیادہ موثر اور بلیغ اسلوب ممکن تھا اس کو تین بار استعمال کیا ہے۔

(۱) لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ

"انہیں ضرور بالضرور خلافت عطا کرے گا"۔

(۲) وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ

"اور ان کے دین کو لازماً تمکن عطا کرے گا"۔

(۳) وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا

"ان کی خوف کی حالت کو جو اس وقت ان پر طاری ہے، لازماً امن میں بدل دے گا"۔

دیکھئے یہ ایک ہی مضمون کی تکرار ہے لیکن قرآن حکیم کی تکرار کی بھی ایک عجیب شان ہوتی ہے۔ جیسے کسی نے کہا ہے:

ع اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

---

[۱] ہر خطبے کے حواشی اس خطبے کے اختتام پر درج کئے گئے ہیں۔

قرآن حکیم میں ایک ہی مضمون کو مختلف اسالیب میں بیان کیا جاتا ہے مگر اس تکرار سے کلام کی تاثیر اور دلکشی میں کمی آنے کے بجائے مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

پھر یہ جو فرمایا کہ "اور ان کے اس دین کو تمکن عطا کرے گا جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے" تو یہ وہی بات ہے جو سورۃ المائدہ میں آئی ہے:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (المائدہ ۔ ۳)

"آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کی تکمیل کر دی تم پر اپنی نعمت کو تمام کر دیا اور تمہارے لئے اسلام کو تا قیام قیامت دین کی حیثیت سے پسند کیا"۔

اور ظاہر ہے کہ جس دین کو اللہ نے پسند فرمایا وہ مغلوب نہیں رہے گا بلکہ اس کو غلبہ اور تمکن حاصل ہو گا۔ یہ گویا وعدۂ استخلاف کی دوسری بار تاکید ہے۔

یہی بات تیسری بار اس طرح بیان فرمائی۔

وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا

"ان کی خوف کی حالت کو جو اس وقت ان پر طاری ہے امن میں بدل دے گا"۔

سورۂ نور کی یہ آیت سن ۵ھ کے اواخر یا سن ۶ھ کے اوائل میں نازل ہوئی تھیں اور جیسا کہ معلوم ہے سن ۵ھ ہی میں غزوۂ احزاب پیش آیا تھا جب عرب کی مجموعی قوت نے تقریباً ایک ماہ اور کئی دن تک مدینہ کا شدید محاصرہ کر لیا تھا۔ ۱۲ ہزار کا لشکر مدینہ کی چھوٹی سی بستی پر حملہ آور ہوا تھا۔ مدینہ کے اندر یہود الگ سازشوں میں مصروف تھے مسلمانوں پر شدید آزمائش کی گھڑی تھی۔ خود قرآن حکیم نے صورت حال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

﴿وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا﴾ (الاحزاب ۔ ۱۱)

"اہل ایمان شدید طور پر ہلا مارے گئے"۔

اس سنگین صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ منافقین کا نفاق ان کی زبانوں پر آ گیا گویا ان کا خبث

باطن ظاہر ہو گیا۔ اس وقت یوں لگتا تھا جیسے لق و دق صحرا میں ایک دیا روشن ہے جسے بجھانے کے لئے ہر طرف سے آندھیاں چل رہی ہیں۔ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ ابھی ہوازن کا بڑا قبیلہ حملہ آور ہو جائے گا۔ نجد کے قبائل یورش کر دیں گے۔ کہیں خیبر کے یہودی ہی نہ ٹوٹ پڑیں یا پھر جنوب کی طرف سے قریش نہ چڑھ دوڑیں۔ یہ تھے وہ حالات جن میں یہ بشارت دی گئی کہ ان کی اس خوف کی کیفیت کو ہم امن سے بدل دیں گے۔

آیۂ مبارکہ کا یہ حصہ بہت ہی اہم ہے کہ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا یعنی "(جب میں ان کو غلبہ عطا کر دوں گا تب) وہ میری بندگی کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے"۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی مسلمان اگرچہ خوف کی حالت ہی میں تھے لیکن بندگی تو اللہ ہی کی کرتے تھے۔ پھر اب غلبۂ دین اور خوف کے خاتمے کے ساتھ بندگی کو کیوں معلق کیا گیا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ توحید اس وقت تک ناقص ہے جب تک اللہ کا دین غالب نہ ہو جائے۔ قرآن حکیم نے اسی بات کو اسی طرح بیان کیا ہے وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال : ۳۹) یعنی "دین کُل کا کُل اللہ کے لئے ہو جائے"۔ غیر اللہ کی حاکمیت کی کاملاً نفی ہو جائے اس لئے کہ غیر اللہ کی حاکمیت کا تصور ہی سب سے بڑا شرک ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ میں آیا ہے: "وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ.... الْفٰسِقُوْنَ.... الْكٰفِرُوْنَ" (المائدہ) یہی وجہ ہے کہ جب تک نظام خلافت قائم نہ ہو تب تک افراد تو موحد ہو سکتے ہیں لیکن نظام بہرحال کافرانہ و مشرکانہ ہی رہتا ہے۔ چنانچہ دراصل توحید کی تکمیل ہی اس وقت ہو گی جب یہ تینوں وعدے پورے ہو جائیں گے۔

فسق اور کفر کی حقیقت

آیۂ مبارکہ کا اختتام اس طرح ہو رہا ہے: "وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ" (اور جو اس کے بعد بھی کفر کریں وہ تو نہایت ہی سرکش لوگ ہیں) اس آیت میں "فاسق" بعینہٖ اسی معنی میں آیا ہے جس معنی میں ابلیس کو سورۂ کہف میں "فاسق" کہا گیا ہے: "كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ"

(وہ جنات میں سے تھا تو اس نے اپنے رب کے حکم کے خلاف "فسق" (سرکشی) اختیار کیا) گویا یہاں فسق سرکشی اور بغاوت کے معنوں میں آیا ہے۔

اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ "اس کے بعد بھی جس نے کفر کیا" تو اس آیت میں کفر کا مفہوم بھی سمجھ لینا ضروری ہے۔ کفر دراصل دو معانی کے لئے استعمال آتا ہے۔ ایک تو کفر اصطلاحی ہے جس کا مطلب اسلام کا انکار' توحید کا انکار' رسالت کا انکار یا ضروریات دین میں سے کسی کا انکار کرنا ہے۔ جبکہ دوسرا کفر وہ ہے جو شکر کے مقابلے میں آتا ہے۔ جیسے کہ قرآن حکیم میں آتا ہے:

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾

(ابراہیم : ۷)

"اگر تم میری نعمتوں کا شکر (اور قدردانی) کرو گے تو میری طرف سے ان میں اور اضافہ ہو گا اور اگر کفر (کفرانِ نعمت) کرو گے تو پھر (یاد رکھو) میرا عذاب بڑا سخت ہے"۔

اسی طرح سورۂ لقمان میں بھی کفر' شکر کے مقابلے میں آیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ﴾ (لقمان : ۱۲)

"جس نے شکر کی روش اختیار کی تو اس نے اپنا ہی بھلا کیا اور جس نے کفرانِ نعمت کا طریقہ اختیار کیا تو (اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ) اللہ غنی (حمد و شکر سے بے نیاز) ہے' حمید ہے (تمام اچھی صفات سے خود متصف ہے)"۔

لیکن سورۂ نور کی جس آیت پر گفتگو ہو رہی ہے اس میں کفر کے یہ دونوں ہی معانی مراد ہیں۔ چنانچہ یہ معنی بھی مراد ہیں کہ:

(۱) "جب اسلام کا غلبہ ہو جائے گا اور اس کے بعد بھی کچھ لوگ اگر کفر پر اڑے رہیں گے تو گویا وہ شیطنت کا مجسمہ ہیں"۔ کیونکہ غلبہ کفر کی حالت میں تو کوئی عذر ہو سکتا ہے کہ آدمی مجبور ہے' حالات کے دباؤ کا شکار ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ دین کا دامن فقط اصحاب ہمت ہی تھام کر رکھیں گے۔ یہی لوگ نظام باطل سے ٹکرانے کی ہمت

کر سکیں گے لیکن دین کے غلبہ کے بعد تو اکثریت کے لئے دین پر چلنا آسان ہو جائے گا۔ چنانچہ اس غلبے کے بعد بھی جو کفر پر اڑا رہے گویا اس میں سرے سے کوئی خیر ہے ہی نہیں۔

(۲) اس کا دوسرا مفہوم بھی ہے جو ہم سے زیادہ متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری (یعنی اللہ تعالیٰ کی) طرف سے اتنے پختہ وعدوں کے بعد بھی اگر تم کمر ہمت نہیں باندھتے تو گویا ہمارے وعدوں کی بڑی ہی ناقدری کر رہے ہو۔

البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس آیت مقدسہ میں جو بھی وعدے ہیں' وہ مشروط ہیں۔ چنانچہ ان کے ساتھ ایمان اور عمل صالح کی شرط لگی ہوئی ہے۔ گویا نام کے مسلمانوں سے اللہ کا وعدہ نہیں ہے۔ ایمان اور عمل صالح کا وعدہ تم پورا کرو گے اور ان کا حق ادا کرو گے تو خلافت عطا کرنے کا وعدہ ہم پورا کریں گے۔ (۳)

سورۂ صف کی آیات کا اجمالی تعارف

اب سورۂ صف کی آیات ۸ تا ۱۳ سے متعلق بھی چند باتیں عرض کرنی ہیں۔ پہلے ان آیات پر ایک نگاہ پھر ڈال لیں :

﴿یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم' واللہ متم نورہ ولو
کرہ الکفرون O ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق
لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون O یایھا
الذین امنوا ھل ادلکم علی تجارۃ تنجیکم من عذاب
الیم O تؤمنون باللہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللہ
باموالکم وانفسکم' ذلکم خیر لکم ان کنتم
تعلمون O یغفر لکم ذنوبکم ویدخلکم جنت تجری
من تحتھا الانھر ومسکن طیبۃ فی جنت عدن' ذلک
الفوز العظیم O واخری تحبونھا' نصر من اللہ وفتح
قریب' وبشر المؤمنین O﴾

"چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کی روشنی کو اپنے منہ سے اور اللہ کو پوری کرنی ہے

اپنی روشنی اور پڑے (۴) برا مانیں منکر۔ وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول سوجھ دے کر اور سچا دین کہ اس کو اوپر کرے سب دینوں سے اور پڑے برا مانیں شرک کرنے والے۔ ایمان والو! میں بتاؤں تم کو ایسی سوداگری جو بچائے تم کو دردناک عذاب سے۔ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور لڑو اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور اپنی جان سے۔ یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ بخشے گا وہ تمہارے گناہ اور داخل کرے گا تم کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں اور ستھرے گھروں میں بسنے کے باغوں کے اندر یہ ہے بڑی مراد ملنی اور ایک اور چیز دے جس کو تم چاہتے ہو۔ مدد اللہ کی طرف سے اور فتح جلدی اور خوشی سنا دے ایمان والوں کو"۔

نورِ خدا کے دشمن؟

ان آیات میں پہلی آیت بہت اہم ہے۔ چنانچہ اس سے متعلق دو نہایت ضروری باتیں میں کسی قدر وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ یریدون (وہ چاہتے ہیں) کا فاعل کون ہے؟ اور "وہ" کا اشارہ کس کی طرف ہے؟ کن کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ وہ اللہ کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھا دینے کے درپے ہیں؟

اس آیت سے پہلے سورۂ صف میں سابق امت مسلمہ یعنی یہود کا تذکرہ چلا آ رہا ہے کہ انہوں نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کا برتاؤ کیسا تھا اور یہ کہ وہ اب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا معاملہ کر رہے ہیں۔ یہ سابقہ امت مسلمہ کے تین ادوار کا ذکر ہے جو سورۂ صف کے پہلے رکوع میں انتہائی جامعیت کے ساتھ آ گیا ہے۔ تو گویا اس آیت میں یہود ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں۔ (۵)

پھر یہود ہی کے بارے میں یہ بات کیوں کہی گئی کہ وہ اللہ کے نور کو گل کرنا چاہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے جزیرہ نمائے عرب میں اس وقت مسلمانوں کے جو دشمن موجود تھے ان پر ایک نگاہ ڈالنی ہوگی۔ ان میں سے ایک تو مشرکین تھے جن کے سرخیل قریش مکہ تھے مگر یہ بہت بہادر اور جری لوگ تھے۔ سامنے سے حملہ کرتے تھے

جبکہ دوسرے دشمن تھے یہود۔ یہ انتہائی بزدل تھے ان کے بارے میں سورۂ حشر میں آیا ہے کہ "یہ کبھی کھلے میدان میں مقابلہ نہیں کریں گے۔ ہاں چھپ کر قلعوں کے اندر سے پتھراؤ کریں گے۔ ابوجہل نے تو اپنے دین کے لئے بہرحال گردن کٹوائی مگر ان میں اس کی ہمت نہیں ہے تو صرف پھونکوں سے کام چلانا چاہتے ہیں کیونکہ پروپیگنڈے اور سازشوں کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں۔ مگر ان کی سازشوں اور پروپیگنڈے کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿واللہ متم نورہ ولو کرہ الکفرون ○﴾

"اللہ تعالیٰ اپنے نور کا اتمام کر کے رہے گا چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو"۔[۱۶]

آیت کے اس پہلو پر زور اس لئے دے رہا ہوں کہ آج کے حالات میں بھی اسی صورتحال کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ گویا

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

بعینہٖ یہی کیفیت یہود کی آج بھی ہے۔ اس وقت صیہونیت جس طرح اسلام کے اس نور کو بجھانے کی فکر میں ہے اور جس تیزی سے یہود اپنے منصوبے روبہ عمل لا رہے ہیں اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ دنیا کی سب سے بڑی حکومت Sole Supreme Power کے طور پر بھی وہی سوار ہیں۔ انہوں نے پوری دنیا میں Islamic Fundamentalism یعنی "اسلامی بنیاد پرستی" کا ہوا کھڑا کر دیا ہے۔ یہ سب کچھ آج بھی آپ اس آیت کے بین السطور میں پڑھ لیجئے۔

رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ﴿ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون ○﴾ "وہی اللہ ہے جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو الہدیٰ یعنی قرآن حکیم اور دینِ حق دے کر تاکہ غالب کر دے اس کو کل کے کل دین پر یعنی پورے نظامِ زندگی پر خواہ مشرکوں کو یہ بات

ناپسند ہو"۔

اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ حقیقت بڑی اہم ہے کہ جب تک نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت کا صحیح صحیح فہم حاصل نہ ہو۔ سیرۃ النبی سمجھ میں نہیں آ سکتی' نہ ہی قرآن حکیم کا گہرا فہم و ادراک حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ بات میں دراصل امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی" کے حوالے سے کہہ رہا ہوں۔ جنہوں نے اس آیہ مبارکہ کو پورے قرآن کا عمود قرار دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ کسی بھی بڑی شخصیت کے کارناموں اور کاوشوں کی قدر و قیمت متعین کرنے اور ان کے اثرات کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کا مقصد متعین ہو جائے۔ تب ہی تو آپ تجزیہ کر سکیں گے کہ وہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب رہی اور کتنی ناکام۔ نیز یہ کہ اس نے اپنا ہدف کس طور پر سے اور کس حد تک حاصل کیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت صرف تبلیغ نہیں' ہے بلکہ غلبہ دین حق ہے۔ ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق موجود ہے۔ اگر فقط تبلیغ کرنی ہوتی تو شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ہاتھ میں تلوار نہ لیتے۔ لیکن غلبہ دین حق کے لئے ہاتھ میں تلوار ہاتھ میں لئے بغیر چارہ نہیں۔ اسی حقیقت کے منکشف ہونے سے تو ساری بات کھلتی ہے۔ تبلیغ تو بدھ مت کے بھکشو بھی کرتے ہیں۔ آخر یہ عیسائی مشنری والے بھی تو تبلیغ میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ مگر یہ تبلیغ جس سطح پر کر رہے ہیں اس میں کسی تصادم کی ضرورت نہیں پیش آتی اس لئے کہ محض تبلیغ کے کچھ اور تقاضے ہوتے ہیں جبکہ غلبہ دین کے کچھ اور تقاضے ہیں۔ نبی اکرم" کا مقصد بعثت ہی غلبہ دین حق ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ یہ مشرکوں کو بہت ہی ناگوار ہو گا۔ یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہئے کہ مشرک ہے کون؟ ہر وہ شخص یا ادارہ جو دین حق کے مقابلے میں کوئی اور نظام آپ کے سامنے رکھے وہ مشرک ہے۔ مگر ہم نے شرک کو صرف چند عقائد تک محدود کر دیا ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علم کلام

غلبہ دین اور جہاد و قتال

اللہ کا دین غالب ہو گا۔ نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت ہی غلبہ دین ہے۔ لیکن اس کے لئے سرفروشی، جانفشانی اور جہاد و قتال کے مراحل تو مومنین صادقین ہی کو طے کرنے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

> ﴿یایھا الذین امنوا ھل ادلکم علی تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم ۝ تؤمنون باللہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم، ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون ۝﴾ [الصف: ۱۱-۱۰]
>
> "اے اہل ایمان کیا میں تمہاری رہنمائی اس تجارت کی طرف کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلا دے؟ (یہ کہ) ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ۔ اگر تم علم (حقیقی) رکھتے ہو تو تم (جان لو گے کہ) یہی تمہارے لئے بہتر ہے"۔

سورۂ صف کی ان آیات پر ذرا ٹھہر کر ہمیں اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہئے۔ سورۂ نور کی آیت ۵۵ میں نظام خلافت کے قیام کے لئے دو شرائط آئی تھیں۔ یعنی وعدہ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ مشروط تھا۔ اس مقام پر بھی دو ہی شرائط آئی ہیں۔ یعنی ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ۔ وہ ایمان، وہ عمل صالح اور وہ جہاد کون سے ہیں جن سے یہ وعدے پورے ہو سکتے ہیں؟ افسوس ہے کہ ہمارے ذہنوں میں ایمان، عمل اور جہاد کے معنی بہت محدود اور مسخ شدہ ہیں۔ اس لئے ان کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔

دنیوی اور اخروی وعدے

سورۂ صف کی مذکورہ بالا آیات میں دو وعدے مذکور ہیں جبکہ سورۂ نور کی آیت ۵۵ میں تین وعدے آئے ہیں، مگر سورۂ نور میں جن وعدوں کا ذکر ہے ان کا تعلق دنیا سے ہے۔ یعنی اے مسلمانو! ہم تمہیں خلافت عطا کریں گے، دنیا میں تمہارا دین غالب ہو جائے گا اور دنیا میں تمہاری خوف کی کیفیت امن سے بدل دی جائے گی۔ جبکہ سورۂ صف کی

مذکورہ بالا آیات میں پہلے آخرت کا نتیجہ بیان کیا ہے۔ یعنی اے ایمان والو! اگر تم اللہ اور اس کے رسول پر حقیقی ایمان رکھو گے اور جہاد فی سبیل اللہ پر کاربند رہو گے تو وہ تمہارے گناہ بخش دے گا' تمہیں جنتوں میں داخل کرے گا اور ہمیشہ ہمیشہ کے باغات میں تمہیں نہایت پاکیزہ مسکن عطا کرے گا۔ اور اسی اخروی نتیجہ کو بڑی کامیابی قرار دیتے ہوئے فرمایا: ﴿ذٰلک الفوز العظیم﴾ اس طرح ہمارے معیارِ خیر و شر (Value Structure) کو بھی درست کر دیا گیا ہے کہ اصل کامیابی دنیا کی نہیں آخرت کی ہے۔ اسی لئے آگے چل کر تقابل (Contrast) میں فرمایا: ﴿واخرٰی تحبونها﴾ (ایک اور شے جو تمہیں پسند ہے)

اس موقع پر امام رازی نے تفسیر کبیر میں بڑی صراحت سے لکھا ہے کہ "یہاں درحقیقت اس بات کی مذمت کی گئی ہے کہ یہ تمہاری بشریت ہے جس کی وجہ سے تم دنیا کی فتح و کامیابی کو اہمیت دیتے ہو مگر اللہ کی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر اہمیت ہوتی تو (اہل ایمان کو) آن واحد میں فتح عطا کر دیتا۔ اللہ کی نگاہ میں تو تمہاری آزمائش اور امتحان کو اہمیت حاصل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون اس آزمائش میں پورا اترتا ہے۔ حضرت حمزہؓ اپنی آنکھوں سے فتح مکہ کا منظر نہیں دیکھ سکے تو کیا وہ ناکام ہو گئے؟ حضرت سمیہؓ اور حضرت یاسرؓ تو مکہ میں ہی شہید ہو گئے' ان کو مدینہ کا دار الامن دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔ لہٰذا اصل کامیابی ثابت قدمی ہے۔ ایمان و عمل صالح کا حق ادا کرتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کر دینا ہی فوز عظیم ہے۔

اخروی کامیابی کی اہمیت واضح کرنے کے بعد دنیا سے متعلق وعدوں کا ذکر ہوا ہے:

﴿واخرٰی تحبونها' نصر من الله وفتح قریب' وبشر المؤمنین﴾

یعنی اللہ کی طرف سے مدد آیا ہی چاہتی اور فتح تمہارے قدم چوما چاہتی ہے۔ اور اے نبی! ہمارے مومن بندوں کو بشارت دے دیجئے کہ تمہاری سخت آزمائشوں کا زمانہ اب ختم ہوا چاہتا ہے۔ تم نے ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کر دیا ہے اور جہاد کے تقاضے بھی پورے کر دیئے ہیں۔

قرآن حکیم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب

تو آزمائش انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور اہل ایمان اس میں بھی اپنی ثابت قدمی اور استقلال کا مظاہرہ کر دکھاتے ہیں تب اللہ کی مدد بلا تاخیر دستگیری کے لئے آجاتی ہے۔ اسی اصول کے تحت اس آیت میں بھی مومنین کو فتح اور نصرت کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔

وعدۂ استخلاف کی تکمیلِ اول

آیئے اب یہ دیکھیں کہ تاریخی اعتبار سے یہ وعدۂ استخلاف و نصرت کتنی جلدی پورا ہوا۔ مذکورہ بالا آیات سن ۵ھ کے اواخر یا سن ۶ھ کے اوائل میں نازل ہوئیں۔ ۶ھ کے ذی القعدہ میں صلح حدیبیہ ہو گئی اور قرآن نے اعلان کر دیا ﴿انا فتحنا لک فتحا مبینا﴾ (الفتح : ۱) "اے نبی! ہم نے تم کو فتح مبین {۷} عطا کی"۔ ۶ھ کی صلح حدیبیہ کے فوراً بعد ۷ھ میں خیبر فتح ہو گیا۔ مسلمانوں کی تنگدستی ختم ہوئی۔ ۸ھ میں خود مکہ فتح ہو گیا اور جزیرہ نمائے عرب میں اعلان کر دیا گیا: ﴿براءۃ من اللہ ورسولہ الی الذین عاھدتم من المشرکین﴾ (التوبہ : ۱) یعنی "مشرک کان کھول کر سن لیں کہ آج کے بعد سے ان کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہیں"۔ چنانچہ ایک سال کے اندر اندر جزیرہ نمائے عرب سے کفر و شرک کا خاتمہ کر دیا گیا۔ سورۂ توبہ میں (Mopping up operation) کا اعلان کر دیا گیا۔ کسی علاقے کے مفتوح ہو جانے کے بعد بھی کہیں کہیں مزاحمتی اور دفاعی مورچے (pockets of resistance) باقی رہ جاتے ہیں۔ فتح مکہ کے بعد ان مزاحمتی مورچوں کی صفائی سن ۹ھ میں ہوئی۔ اور پھر ۹ھ کے اواخر یا ۱۰ھ کے اوائل تک ﴿جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا﴾ (بنی اسرائیل : ۸۱) کا چشم سر مشاہدہ ہو گیا اور جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اللہ کا دین غالب ہو گیا۔ نظام خلافت کا وعدہ پورا ہو گیا۔ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد ۲۳ برس کے اندر اندر دریائے جیحوں سے لے کر بحر اوقیانوس تک نظام خلافت غالب ہو گیا۔ گویا آیات استخلاف کے نزول کے بعد تیس برس کے اندر اندر معروف دنیا کے بہت بڑے رقبے پر وہ کیفیتیں پوری ہو گئیں جن کو ﴿لیستخلفنھم فی الارض ..... ولیمکنن لھم

دينهم الذي ارتضى لهم وليبدلنهم من بعد خوفهم امنا ﴾ کے بلیغ انداز میں بیان فرمایا گیا تھا۔

قافلۂ سخت جاں، منزل بمنزل

یہ تو ہے وعدۂ استخلاف و نصرت کی تکمیل اولیٰ۔ البتہ اس کے بعد کیا ہوا اس وقت سے اب تک ہم کن کن مرحلوں اور وادیوں سے گزرے اور اب

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

یہ تیرہ سو اکتیس برس کی تاریخ ہے۔ ۶۳۲ء میں نبی ﷺ کی وفات ہوئی تیس برس خلافت راشدہ کے اور نکال دیجئے اس حساب سے تیرہ سو اکتیس سال بنتے ہیں {۸}۔ اگر ہم اپنی کوشش سے اس ساری داستان کو بہت مختصر کر کے بیان کریں تو بھی بات بہت طویل ہو جائے لیکن یہ کلام نبوی کی بلاغت ہے کہ ہم اس طویل تاریخ کو صرف ایک حدیث نبوی سے سمجھ لیں گے۔

نبی اکرم ﷺ نے ایک حدیث مبارک میں اپنے زمانے سے لے کر قیامت تک پانچ ادوار کا ذکر کیا ہے۔ ہماری پوری تاریخ اس حدیث میں سمٹ کر آگئی ہے۔ مسند احمد بن حنبلؒ کی روایت ہے جسے حضرت نعمانؓ بن بشیر نے روایت کیا ہے: "تکون النبوۃ فیکم ماشاء اللہ ان تکون ثم یرفعھا اللہ اذا شاء ان یرفعھا" (مسلمانو!) تمہارے اندر نبوت رہے گی جب تک اللہ چاہے گا پھر جب اللہ چاہے گا اس نبوت کو اٹھائے گا) پھر آپ ﷺ نے دوسرے دور کا ذکر کیا ہے {۹}۔ ثم تکون خلافۃ علی منہاج النبوۃ (پھر خلافت ہوگی منہاج نبوت پر)

خلافت علیٰ منہاج النبوۃ

اس کے الفاظ بہت قابل غور ہیں۔ اس دور کے لئے ہمارے ہاں معروف اصطلاح "خلافت راشدہ" ہے۔ تاہم یہ اصطلاح حدیث میں اس طرح نہیں آئی۔ ہاں "خلفاء راشدین" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، جیسا کہ مشہور حدیث ہے: علیکم

بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المہدیین (میری سنت کا اتباع کرنا اور میرے خلفاء راشدین المہدیین کی سنت کا اتباع کرنا تم پر لازم ہے)۔ لیکن حضرت نعمانؓ بن بشیر کی زیر مطالعہ روایت میں خلافت کی جو صفت آئی ہے وہ اتنی مشہور نہیں ہے۔ اللہ نے یہ توفیق ہم کو دی کہ ہم اپنی تقاریر اور مطبوعات کے ذریعے اس صفت کو عام کر رہے ہیں۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے معنی ہوں گے کہ "بعینہٖ نبوت کے نقش قدم پر خلافت"۔ یہ "بعینہٖ" کا لفظ خصوصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ خلافت راشدہ میں وہ نظام جو محمد عربی ﷺ نے بنفس نفیس قائم کیا تھا وہ بعینہٖ بتمام و بکمالہ جوں کا توں قائم رہا۔

دور صدیقؓ کی مثال

اس سلسلہ میں صرف ایک مثال دینا کافی سمجھتا ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد مبارک کے آغاز ہی میں مانعین زکوٰۃ کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا اور حضرت عمرؓ جیسے عظیم شخص نے بھی مصلحت اندیشی کا مشورہ دیا کیونکہ دو محاذ پہلے ہی کھلے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایک محاذ پر رومیوں سے جنگ کے لئے جیش اسامہؓ کو یہ کہہ کر روانہ کر دیا تھا کہ اس لشکر کے بھیجنے کا فیصلہ خود نبی ﷺ نے کیا تھا اس کا علم خود دست مبارک سے باندھا میں اسے کیسے کھول سکتا ہوں۔ دوسرا محاذ جھوٹے مدعیان نبوت کے خلاف کھل چکا تھا، ان کے کفر میں کسی شک کی گنجائش نہ تھی، چنانچہ ان سے تو لڑنا ہی تھا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے حضرت عمرؓ نے کہا "اب تیسرا محاذ نہ کھولئے" اس بات پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ردعمل (Reaction) بڑا ہی سخت تھا۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کو بھی ڈانٹ پلا دی۔ یہ حضرت ابوبکرؓ ہی کا مقام ہے کہ حضرت عمرؓ جیسی ہستی کو وہ ڈانٹ سکتے تھے۔ صحابہؓ میں کسی اور کا یہ مقام نہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: اے عمرؓ تم جاہلیت میں تو بڑے سخت تھے، اسلام میں آ کر بزدل بن گئے؟ (أجبار فی الجاھلیۃ و خوار فی الاسلام؟) اور دوسری بات جو آپ نے فرمائی وہ دراصل اسی کو بیان کرنے کے لئے یہ سارا واقعہ میں نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: أینقص الدین وانا حیّ؟)

میرے جیتے جی دین میں کمی کی جائے گی! آپ نے مزید فرمایا "خدا کی قسم! اگر حضور ﷺ کے زمانے میں زکوٰۃ کے اونٹوں کے ساتھ یہ ان کو باندھنے کی رسیاں دیتے تھے مگر اب رسی دینے سے انکار کریں گے تو بھی میں ان سے جنگ کروں گا"۔

کیمونزم اب تو قصۂ پارینہ بن چکا ہے، لیکن اس کے زوال کا آغاز نظریات میں ترمیم سے ہوا تھا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ کیمونزم عالمی نظریہ کے بجائے روسی قوم پرستی (Russian Nationalism) کا لبادہ اوڑھ چکا ہے، چنانچہ تحریف کی ایک خشت کج نے پوری عمارت کو زمین بوس کر دیا۔

دور حاضر کی اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے موقف پر غور کریں۔ آپ نے اظہار مافی الضمیر میں فصاحت و بلاغت کی بھی حد کر دی۔ کہاں اونٹ اور کہاں اس کی رسی، لیکن جناب صدیق اکبر کو اتنی مداہنت یا ترمیم بھی گوارہ نہ تھی۔ آپ کے جذبات کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے اعلان کر دیا تھا "خدا کی قسم اور کوئی میرے ساتھ جائے یا نہ جائے میں تن تنہا جاؤں گا اور ان سے جنگ کروں گا۔ تو امت نے آپ کو "افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق" (بلاشبہ انبیاء کے بعد تمام انسانوں سے افضل) کا اعلیٰ مقام یونہی تو نہیں دے دیا تھا۔ آپ جیسا رقیق القلب انسان اس نازک موقع پر عزیمت و استقلال کا کوہ ہمالہ نظر آتا ہے۔

بہرحال اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے معنی حقیقتاً ہیں کیا اور اس سے فی الواقع مراد کیا ہے۔ اسی خلافت کو عرف عام میں خلافت راشدہ کہا جاتا ہے۔

حضور نے اپنی حدیث مبارک میں مزید فرمایا کہ یہ نظام بھی اس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا۔ اس کے بعد یہ بھی ختم ہو جائے گا۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس نکتے پر بھی غور کر لیں کہ کیا خود حضور ﷺ کا دور بھی دور خلافت تھا یا نہیں؟ یقیناً آپ کا دور بھی خلافت ہی ہے۔ ہر نبی اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہوتا ہے۔ قرآن حکیم خود کہتا ہے: ﴿ یٰداؤد انا جعلنٰک خلیفۃ فی الارض ﴾ (ترجمہ) "اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا"۔ بلکہ آپ ﷺ کا دور خلافت اب ایک "ماڈل" کی حیثیت رکھتا

ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے ﴿لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ﴾ (الاحزاب : ۲۱) (تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے) چنانچہ اب قیامت تک جو بھی نظام ہوں گے انہیں اسی کے حوالے سے پرکھا جائے گا۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسرے دور کا ذکر اس طرح فرمایا ہے: "ثم یکون ملکا عاضا فتکون ما شاء اللہ ان تکون ثم یرفعھا اللہ اذا شاء ان یرفعھا" یعنی "پھر ایک دور ملوکیت آئے گا اور یہ کاٹ کھانے والی ملوکیت ہوگی۔ یہ دور بھی اس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ جب چاہے گا، اسے بھی اٹھا لے گا"۔

ظالم ملوکیت کا دور

خلافت راشدہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے بعد جس نظام کو عرف عام میں خلافت کہا جاتا ہے حدیث نبوی میں اسے ملوکیت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ تاہم اس دور کو ہم اس معنی میں خلافت کہہ سکتے ہیں کہ وہاں از کم نظری طور پر کتاب و سنت کی مکمل بالادستی تسلیم کی جاتی تھی۔ اس قسم کی بالادستی خلافت بنو امیہ میں بھی تھی اور خلافت بنو عباس میں بھی اور خلافت عثمانیہ میں بھی یہ بالادستی قائم رہی۔ ہاں اقتدار کی منتقلی اور دولت کی تقسیم کا نظام عملاً بدل گیا تھا۔ اور دور بنو امیہ کے ۹۰ برس دراصل عبوری مدت ہے۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ سے ملوکیت تک بات ایک دن میں نہیں پہنچی تھی۔ چنانچہ اصل ملوکیت تو بنو عباس کے دور میں شروع ہوئی۔

بنو امیہ کے مظالم

بہرحال بنو امیہ کی حکومت بھی یقیناً ظالم تھی۔ حضرت حسین بن علیؓ کے ساتھ میدان کربلا میں جو کچھ ہوا اس سے تو بچہ بچہ واقف ہے کیونکہ اس کا تذکرہ تو اہتمام کے ساتھ بڑے تواتر سے ہوتا ہے، لیکن اسی جیسا سلوک حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ساتھ حرم مکہ میں ہوا، ان کو بے دردی سے ذبح کیا گیا اور لاش کو تین دن تک بے گور و کفن سولی

کے تختہ پر شکار کھا گیا۔ حرم مکی کی حرمت کو بٹہ لگایا گیا۔

اسی دور میں واقعہ حرہ بھی پیش آیا۔ اس واقعہ میں تین دن تک مدینہ منورہ میں لوٹ مار کی گئی۔ خواتین کی بے حرمتی کی گئی اور حجاج بن یوسف کے ہاتھوں سینکڑوں تابعین شہید کئے گئے اگر میرے نزدیک اس سے بڑا ظلم یہ تھا کہ محمد بن قاسم کو سندھ سے واپس بلا کر شہید کر دیا گیا۔ وہ نوجوان تھا لیکن اس قدر پرسا تھا کہ ہندوؤں نے اپنے معیار و عقیدہ کے مطابق اسے اوتار قرار دے دیا اور اس کی مورتیاں بنا کر پوجا شروع کر دی۔ ایسے متقی اور عادل حکمران کو اگر موقع مل جاتا تو پورا ہندوستان فتح ہو جاتا' لیکن اس سے ملوکیت کو بڑا خطرہ لاحق ہو جاتا۔ ملوکیت میں تو سوچنے کا انداز یہی ہوتا ہے کہ کسی شخص کا ہر دلعزیز ہونا تخت شاہی کے لئے خطرہ ہے۔ محمد بن قاسم کا بھی یہی جرم تھا کہ وہ مخالف اقتدار میں برسراقتدار آنے والے بادشاہ کے مخالف گروپ میں شمار ہوتا تھا۔ جو کچھ محمد بن قاسم کے ساتھ ہوا بعینہ موسیٰ بن نصیر کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے شمالی افریقہ کا اکثر و بیشتر حصہ فتح کیا تھا۔ طارق بن زیاد موسیٰ بن نصیر کے ادنیٰ کمانڈر تھے۔ موسیٰ بن نصیر کو بھی ذلیل کیا گیا' دھوپ میں کھڑا کیا گیا' بہت بوڑھے تھے' بے ہوش ہو کر گر گئے۔ دونوں کو بادشاہت کے لئے خطرہ سمجھا گیا۔

بنو عباس کا تعیش

یہ تو حالت بنی امیہ کے دور کی ہے۔ اس کے بعد بنو عباس کے دور میں جو کچھ ہوا وہ بھی تاریخ کا حصہ ہے۔ جو ٹھاٹ اس دور میں تھے' رقص و سرود کی جو محفلیں سجائی گئیں' وہ سب کو معلوم ہیں۔ کوہ قاف کا سارا نسوانی حسن بغداد کے محلوں میں کھنچا چلا آ رہا تھا۔ یہ ہے تیسرا دور جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "کاٹ کھانے والی ملوکیت" سے تعبیر کیا ہے۔

جبریہ یعنی ملوکیت

چوتھے دور کے بارے میں آپ ؐ نے فرمایا: "ثم تکون ملکا جبریۃ ثم یرفعہا اللہ اذا شاء ان یرفعہا" یعنی "پھر ایک اور ملوکیت آئے گی وہ مجبوری

والی ملوکیت ہوگی۔ پھر اس کو بھی اللہ جب چاہے گا اٹھا لے گا"۔

ان دو قسم کی ملوکیتوں میں کیا فرق ہے؟ اس سوال کے جواب کے سلسلہ میں ہمارے پاس نہ اس امر کی کوئی شہادت موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ سے اس کے بارے میں کوئی سوال کیا گیا ہو، نہ یہ معلوم ہو سکا کہ اس زمانے میں ان دونوں ملوکیتوں کے درمیان کیا فرق سمجھا گیا، مگر آج کے حالات میں ہمارے سامنے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ ان سے مراد کیا ہے۔ پہلا دور ملوکیت وہ تھا جب ملوک مسلمان تو تھے لیکن اس کے بعد جو ملوکیت ہم پر مسلط ہوئی وہ غیر مسلموں کی تھی۔ یہ مغربی استعماریت کا دور ہے۔ ہم برطانیہ کے غلام، فرانس کے غلام، اٹلی کے غلام اور ولندیزیوں کے غلام ہوتے چلے گئے۔ یہ چوتھا دور ہے جس کی اس حدیث مبارکہ میں خبر دی گئی ہے۔

بالواسطہ غلامی کا دور

یہ دور ابھی ختم نہیں ہوا۔ براہ راست غلامی تو ختم ہو گئی لیکن بالواسطہ یعنی (Indirect Rule یا Rule By Proxy) ابھی برقرار ہے۔ پوری امت مسلمہ ہنوز ان کے شکنجے میں ہے۔ ہماری معیشت اور وسائل ان کے قبضے میں ہیں۔ ہمارے دماغ ان کے قابو میں ہیں۔ ذہنی، فکری اور تمدنی اعتبار سے ہم ان کے غلام ہیں۔ علم اور ٹیکنالوجی میں ہم ان کے بھکاری ہیں۔ دراصل یہ چوتھا دور جزوی طور پر ختم ہوا ہے لیکن معنوی اعتبار سے اس کا تسلسل اب بھی جاری ہے، اور اس غلامی کا جو حصہ باقی ہے وہ پہلے سے زیادہ تلخ اور اس کے شدائد اور مصائب پہلے سے کہیں بڑھ کر ہوں گے۔

دور سعادت کی نوید جاں فزا

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا، حدیث مبارکہ کے مطابق بہرحال اس دور کو بھی ختم ہونا ہے اور اس کے بعد آپؐ نے آخری دور کا تذکرہ فرمایا ہے: "ثم تكون خلافة على منهاج النبوة" (پھر خلافت علی منہاج النبوۃ کا دور آئے گا) یہ ہے وہ نوید جاں فزا،

وہ خوشخبری جو موجودہ مایوس کن حالات کے لئے نبی اکرم ﷺ نے سنائی ہے۔

اس حدیث مبارکہ کے راوی حضرت نعمانؓ بن بشیر فرماتے ہیں کہ "ثم سکت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" یعنی "اس کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔" اس حدیث مبارکہ کو مولانا مودودی مرحوم نے قدرے تفصیل سے اپنی کتاب "تجدید و احیائے دین" میں نقل کیا ہے۔ اس روایت میں اضافی مضمون یہ ہے کہ۔

> "جب خلافت علیٰ منہاج النبوت کا نظام قائم ہو جائے گا تو لوگوں میں معاشرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہو گا اور اسلام اپنے جھنڈے زمین میں گاڑ دے گا۔ آسمان والے بھی راضی ہو جائیں گے اور زمین والے بھی۔ آسمان اپنا ہر ہر مبارک قطرہ موسلا دھار بارش کی شکل میں زمین پر برسا دے گا۔ اور زمین بھی اپنے تمام معدنی اور نباتی خزانے اگل دے گی"۔

گویا اس حدیث مبارکہ میں اس نظام خلافت کی اضافی شان وارد ہوئی ہے۔ افسوس مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم۔ نے حوالہ نہیں دیا۔ میں اب تک امکانی کوشش کے باوجود حوالہ تلاش نہیں کر سکا۔

اگر اس وقت کے معروضی حالات کو دیکھا جائے تو یہ بشارت بالکل ناممکن الوقوع نظر آتی ہے۔ لیکن ہمارے ایمان کا تقاضا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم نے مان لیا ہے کہ وہ الصادق والمصدوق ہیں قرآن کی ہر خبر پر ایمان لانا لازم ہے۔ حدیث صحیح ہے لہٰذا ایمان لانا ہے۔ شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ ہم یقین کریں یا نہ کریں، ہو نا وہی ہے جس کی آپؐ نے خبر دی ہے۔

بیسویں صدی کی تاریخی اہمیت

اب چند باتیں بیسویں صدی کے حوالے سے بھی عرض کرنی ہیں۔ تاریخ انسانی میں بیسویں صدی سے زیادہ ہنگامہ خیز دور کوئی نہیں گزرا۔ اس صدی میں دو عظیم مملکتوں کا ایسا

خاتمہ ہوا کہ نام و نشان تک مٹ گیے۔ صدی کے آغاز میں "سلطنت عثمانیہ" جو تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی نسیاً منسیاً ہو گئی جبکہ اس صدی کے اختتام پر U.S.S.R. جیسی سپر طاقت "ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا" کی تصویر بن گئی۔ کیا عجب کہ اسی صدی میں کوئی تیسری طاقت بھی اسی طرح پگھل کر رہ جائے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ امریکہ کا یہ انجام دور نہیں ہے۔ امریکی معیشت سخت بحران کا شکار ہے۔ اس کی معیشت کا اصل lever یہود کے ہاتھ میں ہے۔ یہودی جب چاہیں گے ایک جنبش میں سب کچھ ختم کر دیں گے۔ میں تو ان حقائق کو دو اور دو چار کی طرح جانتا ہوں۔ وقت دور نہیں ہے جب وہ مسجد اقصیٰ کو منہدم کر کے اس کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کریں گے۔ مسلمان ممالک میں سے ان کے راستے میں کوئی مزاحم نہیں ہے۔ اگر مزاحم ہو گا تو امریکہ ہی ہو گا۔ لہٰذا وہ پہلے اس کا خاتمہ کریں گے۔ جو لوگ مغرب کے حالات کا مطالعہ صیہونی تحریک کے عزائم کے پیش نظر میں کرتے ہیں وہ یقین کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ امریکہ کا یہ انجام دور نہیں ہے۔

بیسویں صدی عیسوی میں ہی دو عظیم جنگیں ہوئی ہیں' جن میں کروڑوں انسان قتل ہوئے۔ کیا تیسری جنگ نہیں ہو سکتی؟ نبی اکرم ﷺ نے احادیث مبارکہ میں الملحمۃ العظمٰی کی خبر دی ہے' اسے جنگ عظیم نہیں جنگ اعظم کہیں گے۔ اس لئے کہ عظمیٰ اعظم کا مونث ہے۔ حالات تیزی سے اس طرف جا رہے ہیں۔ دراصل یہ تیسری ۱۰۱ صلیبی جنگ ہوگی۔ احادیث مبارکہ کے علاوہ اس کا تذکرہ بائبل میں بھی موجود ہے۔

بیسویں صدی کا تیسرا عجوبہ

۱۔ بیسویں صدی ہی کا تیسرا عجوبہ یہ ہے کہ یہودی قوم جو دو ہزار سال سے دربدر تھی' اسے اس صدی میں گھر مل گیا۔ اسرائیل وجود میں آ گیا اور آیا بھی کس شان و شوکت سے!

۷۰ عیسوی سے یہودی بے گھر تھے۔ ٹائٹس رومی نے یروشلم پر حملہ کیا تھا۔ ایک لاکھ سے زیادہ یہودی ایک دن میں قتل ہوئے۔ ہیکل سلیمانی مسمار کر دیا گیا جو اب تک

مسمار پڑا ہے۔ اسی لئے یہودی اس کو اپنی تاریخ کا دور انتشار (Diaspora) کہتے ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ یہودی دنیا میں تیرہ چودہ ملین (یعنی ایک کروڑ تیس لاکھ) سے زائد نہیں ہیں۔ اس کے برعکس امت مسلمہ میں سے صرف عربوں کو شمار کیا جائے تو وہی بیس پچیس کروڑ ہیں لیکن ان کی جو معنوی حقیقت ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ میں سوچا کرتا ہوں کہ شاید یہود کا موجودہ تسلط اور استیلاء بجھنے سے پہلے چراغ کی آخری بھڑک ہو۔ اس کے بعد شاید یہ مغضوب و ملعون قوم تباہ و برباد کر دی جائے۔

اہل ایمان کا طلوع و غروب

اگر اس صدی کے آغاز میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا تو کیا اس صدی کے اختتام پر احیائے نظام خلافت نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ہم بقول علامہ اقبال مرحوم یہ منظر دیکھ لیں کہ

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے

یہ نری شاعری نہیں بلکہ تاریخی حقائق ہیں۔ جب اندلس (اسپین) میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکمرانی کا سورج غروب ہو رہا تھا تو اسی وقت مشرق میں اسلام کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

اسلام کو تو قیامت تک رہنا ہے۔ حضور کی حدیث مبارکہ ہے کہ "انا آخر المرسلین وانتم آخر الامم" (میں آخری رسول ہوں اور تم آخری امت ہو) یہ امت کسی ایک نسل پر مبنی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عربوں کو معزول کیا تو اپنے دین کا پرچم ترکوں کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اب ترک اگر معزول ہو گئے ہیں تو کیا عجب اب یہ پرچم اسلام ہندیوں کے ہاتھوں میں آنے والا ہو جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے:

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

یہ منظر تاریخ انسانی پہلے بھی دیکھ چکی ہے:

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اور ؎

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

کوئی بعید نہیں کہ آفتابِ خلافت جو اس صدی کے آغاز میں غروب ہوا وہ اس کے اختتام پر طلوع ہو جائے۔

مسلمانانِ برعظیم کا استحقاق

بیسویں صدی کے حوالے سے آخری بات یہ ہے کہ جب خلافت کا برائے نام ادارہ بھی اغیار کی سازشوں اور اپنوں کی نادانیوں سے ختم کر دیا گیا تو ردِعمل کہاں ظاہر ہوا؟ صرف اور صرف برعظیم پاک و ہند میں صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ خلافت کا ادارہ تو پورے عالمِ اسلام کی وحدت کا نشان تھا اس لئے آنسو تو پورے عالمِ اسلام میں بہائے جانے چاہئیں تھے' لیکن کہیں کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔ اس ادارے کی بحالی کی تحریک چلی تو صرف اس محروساتِ ہند میں چلی اور اس شدت سے چلی کہ گاندھی کو بھی اس میں شریک ہونا پڑا۔ گاندھی نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر اس نے اس موقع پر مسلمانوں کا ساتھ نہ دیا تو آئندہ کبھی بھی ان کا تعاون حاصل نہیں کیا جا سکے گا۔ چنانچہ پورا برعظیم اس نعرے سے گونج اٹھا ؎

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا خلافت کا یہ برائے نام ادارہ اپنوں کی غداری ہی سے منسوخ ہوا تھا۔ بقول اقبال ؎

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ' اوروں کی عیاری بھی دیکھ

مصطفیٰ کمال نے اس وقت صیہونیت کے ایجنٹ کا کردار ادا کیا[11]۔ ۱۹۲۴ء سے لے کر اب ۱۹۹۴ء تک ستر برس بیت گئے ہیں لیکن پوری دنیا میں خلافت کے ادارے کا برائے نام

وجود بھی نہیں۔ امت مسلمہ کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔

عالمی خلافت

جیسا کہ اس سے قبل بھی کہا گیا ہے کہ نظام خلافت ایک مرتبہ پھر برپا ہو کر رہے گا لیکن اب جب بھی خلافت قائم ہو گی تو یہ دنیا کے کسی ایک خطے پر محدود نہیں ہو گی بلکہ عالمی خلافت ہو گی۔ اس لئے کہ صراحت کے ساتھ احادیث نبوی میں اس کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ حدیث کے علاوہ خود قرآن حکیم میں اس کا صغری کبری [۱۲] موجود ہے۔

قرآن حکیم میں یہ الفاظ مبارکہ ﴿ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ﴾ تین مرتبہ ایک شوشے کے فرق کے بغیر وارد ہوئے ہیں۔ گویا یہ صغری ہے۔

پھر قرآن مجید میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ یہ بات پانچ مرتبہ وارد ہوئی ہے کہ نبی ﷺ کی بعثت پورے عالم انسانی کے لئے ہے' جیسا کہ سورۂ سبا کی آیت ۲۸ میں ہے ﴿وما ارسلنک الا کافۃ للناس بشیرا و نذیرا﴾ یعنی اے نبی! ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا۔ یہ کبری ہے۔ اس کو صغری کے ساتھ جمع کیجئے' نتیجہ سامنے آ جائے گا۔ بعثت محمدی' کا مقصد غلبہ دین ہے (صغری) بعثت محمدی تمام عالم انسانی کے لئے ہے (کبری) غلبہ دین تمام عالم کے لئے ہے (نتیجہ)۔

بعثت کا مقصد غلبہ دین لازماً پورا ہو گا۔ مگر کب؟ اس کے جواب میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس وعدے کا اتمام ہماری آزمائش اور امتحان کی راہ سے گزرتا ہوا آگے بڑھے گا۔ چنانچہ ہمیں علامہ اقبال کا یہ پیغام یاد رکھنا چاہئے کہ –

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

اور جب یہ اتمام ہو جائے گا تو بساط عالم کا نقشہ کچھ اس طرح پر ہو گا --

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود

پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!!

گویا اس وقت ﴿ یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا ﴾ کی تصویر سامنے آ جائے گی۔

غلبۂ دین اور احادیث مبارکہ

اب میں ان پیشین گوئیوں کا حوالہ دوں گا جو احادیث مبارکہ میں آئی ہیں۔ صحیح مسلم کی روایت ہے جس کے راوی حضرت ثوبان ؓ ہیں۔ حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:

> ان اللہ زوی لی الارض فرأیت مشارقھا ومغاربھا وان امتی سیبلغ ملکھا ما زوی لی منھا (مسلم، ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ)
>
> "بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین کو سکیڑ دیا (یا لپیٹ دیا) تو میں نے زمین کے سارے مشرق اور سارے مغرب دیکھ لئے اور (سن لو) میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے زمین سکیڑ کر دکھائے گئے ہیں"۔

ایک دوسری حدیث مسند احمد بن حنبل کی روایت ہے اور اس کے راوی مقداد بن الاسود ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

> لا یبقی علی ظھر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام بعز عزیز او ذل ذلیل۔ اما یعزھم اللہ فیجعلھم من اھلھا او یذلھم فیدینون لھا (مسند احمد بن حنبل بسند صحیح)
>
> "زمین کی پشت پر نہ کوئی اینٹ گارے کا گھر باقی رہے گا نہ کمبلوں سے بنا ہوا

> کوئی خیمہ جس کے اندر اللہ تعالیٰ اسلام کا کلمہ داخل نہ فرمادے، عزت دار کی عزت کے ساتھ یا مغلوبیت پسند کی مغلوبیت کے ساتھ۔ یا تو اللہ ان کو اس کلمہ کے ذریعہ عزت دے گا تو وہ خود اس کلمہ کے حامل بن جائیں گے یا وہ ان کو مغلوب کر دے گا تو وہ اس کے مطیع اور تابع بن جائیں گے"۔
>
> راوی حدیث (حضرت مقداد) کہتے ہیں تو میں نے (اپنے دل میں) کہا تب تو وہ بات پوری ہو جائے گی کہ "دین کل کا کل اللہ کے لئے ہو جائے"۔

گویا احادیث مبارکہ کی ان پیشین گوئیوں کو سامنے رکھا جائے تو اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ کل روئے ارضی پر اللہ کا دین غالب ہو گا۔

فلسفہ ارتقاء اور غلبہ دین

اس بات کو میں دو اور حوالوں سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات کا تعلق فلسفہ ارتقاء سے ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اپنی کتاب Idealogy of the Future میں فلسفہ ارتقاء کے مختلف مراحل بیان کئے ہیں۔ ایک فلسفہ ارتقاء وہ ہے جسے ڈارون نے بیان کیا ہے۔ اس کے فلسفہ ارتقاء کو ذہن سے نکال دیجئے کہ اس کے بعض گوشے ابھی تک حیاتیات کے میدان میں بھی مسلم نہیں سمجھے جاتے۔ تاہم جہاں تک تعلق ہے نفس ارتقاء کا تو اس کو سب سے پہلے بیان کرنے والے تو مسلمان فلسفی ابن مسکویہ ہیں۔ اس فلسفہ کو بعد میں مولانا روم نے بھی بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم ارتقاء کا پہلا مرحلہ Physical Evolution یعنی ارتقاء طبعی بیان کرتے ہیں۔ کائنات کی تخلیق کے جدید نظریات کے مطابق تخلیق کا ایک مرحلہ (Stage) وہ ہے جس سے پھر کیمیاوی مرکبات (Chemical Compounds) بنے ہیں۔ ان سے جب نامیاتی مرکبات (Organic Compounds) وجود میں آ گئے جن میں حیات کی صلاحیت تھی تو گویا Physical Evolution اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گیا۔ اب حیات کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد ارتقاء کا Second Phase ہے حیاتیاتی ارتقاء

(Biological Evolution) ڈارون کی بحث اسی Phase تک محدود ہے۔ انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی یہ ارتقاء بھی اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ اس سے آگے حیاتیاتی ارتقاء کی کوئی منزل نہیں ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے جس مرحلہ ارتقاء کا ذکر کیا ہے (وہ اسے ایک مرحلہ کہتے ہیں مگر میں اسے دو مرحلوں میں تقسیم کرتا ہوں) وہ مرحلہ ہے نفسیاتی اور ذہنی ارتقاء یا Psychological and Intellectual Evolution کا مرحلہ۔ میرے نزدیک اس مرحلے کا انتہائی عروج حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین اس کو نبی اکرم ﷺ تک لے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم کی تین نسبتیں ہیں، یعنی (i) خلیل اللہ (۱۳) (ii) امام الناس اور (iii) ابوالانبیاء یعنی ان کے بعد تمام انبیاء انہی کی نسل سے ہوئے ہیں چاہے وہ بنی اسرائیل میں سے ہوں چاہے بنی اسمٰعیل میں سے ہوں یا بنی مدین میں سے۔

محمد رسول اللہ ﷺ پر رسالت کی تکمیل ہوئی ہے۔ آپ نے ایک معاشرے کو وہاں تک بلند کر دیا جہاں تک اللہ تعالیٰ نے آپ کو رفعت عطا فرمائی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم ہلاک ہوئی، اسی طرح ہود علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کی قومیں ہلاک ہوئیں، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ قوم کو بلندی تک لے گئے، ایک معاشرہ قائم کیا ہے۔ یہ وہ کمال ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے کر دکھایا ہے۔

اب اس سے اگلی بات وہ ہے جس کو ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے بیان کیا ہے۔ ارتقاء کا اب صرف ایک امکانی Phase اور ہے، یعنی Globalization of the Revolution of Mohammad۔ مطلب یہ کہ دنیا کا عمرانی ارتقاء اس انتہا کو پہنچ جائے گا جس کی جھلک محمد رسول اللہ ﷺ نے دکھائی تھی اور نوع انسانی کی اجتماعی یادداشت میں جس کو ایک خوشگوار خواب کی حیثیت حاصل ہے۔ آپ نے جو معاشرہ قائم کیا تھا اس کی بنیاد پر ۱۹۳۷ء میں گاندھی نے اپنے اخبار ہریجن میں ایک مقالے میں کانگریسی وزراء کو خطاب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ: "میں آپ لوگوں کے سامنے ابوبکر و عمر کی مثال پیش کرتا ہوں"۔ نبی اکرم ﷺ نے جو

نظام قائم کیا وہاں تک تو ابھی انسانی فکر پہنچ بھی نہیں سکی ہے۔ علامہ اقبال نے صورت حال کی صحیح صحیح تعبیر کرتے ہوئے کہا ہے:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ست! [۱۴]

گویا انسانیت کے دامن میں جو خیر اور بھلائی ہے وہ نورِ مصطفیٰ ﷺ سے مستعار ہے۔ یا پھر انسانیت ابھی اس طرف جا رہی ہے جہاں محمد ﷺ نے اسے چودہ سو برس پہلے ہی پہنچا دیا تھا۔ یہ ہے ارتقاء کی آخری منزل! لہٰذا فلسفہ ارتقاء کے حوالے سے بھی "نظامِ خلافت" کا احیاء لازمی ہے۔

New World Order سے نظامِ خلافت تک

اب ہم ایک اور اعتبار سے غور کرتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں نئے عالمی نظام کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔ خلیج کی جنگ کے بعد اس کا شور کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ صنعتی اور سائنسی ترقی کی وجہ سے فاصلے معدوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ پوری دنیا نے ایک شہر کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اسی وجہ سے سوچا جا رہا ہے کہ پوری دنیا کے لئے کوئی ایک نظام بھی تو ہونا چاہئے۔ اسی غرض سے پہلی جنگِ عظیم کے بعد League of Nations وجود میں آئی، لیکن چونکہ اس نظام کے لئے انسان کے پاس کوئی فکری بنیاد نہیں لہٰذا وہ جلد ہی ناکام ہو گئی۔ [۱۵]

"انجمن اقوام" کی ناکامی اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد ایک اور ادارہ "تنظیم اقوام متحدہ" (United Nations Organization) کے نام سے وجود میں آیا۔ یہ بھی عالمی نظام کے قیام کی ایک کوشش ہے۔ مگر یہ ادارہ بھی ناکام ہو چکا ہے۔ اب اس کی حیثیت امریکہ کے گھر کی لونڈی سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ اب یہ New World Order آیا ہے، یہ بھی اسی ارتقاء کی طرف ایک پیش قدمی ہے۔ اگرچہ یہ نیا عالمی نظام ابھی تک پوری طرح جڑ نہیں پکڑ سکا، تاہم عالم اسلام پورے کا پورا

اس کی گرفت میں آ چکا ہے۔ البتہ چین، جاپان اور شمالی کوریا کو زیر نگیں کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔

یہ New World Order درحقیقت Jew World Order ہے۔ یہ ۱۸۹۷ء میں پروٹوکولز کا جو نقشہ "صیہونی اکابر" (Elders of the Zion) نے بنایا تھا (۱۶) وہی تدریجاً روبعمل آ رہا ہے۔ ۱۹۱۷ء کا اعلان بالفور (۱۷) پھر ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا قیام، ۱۹۶۷ء میں عربوں سے جنگ اور اسرائیل کی فتح، یہ سارے واقعات ایک تدریجی عمل کا حصہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیل یروشلم کے سوا تمام معاملات پر گفتگو کے لئے تیار ہے۔ "جریکو میں اپنی قومی حکومت بنا لو"۔ "غزہ میں بھی Self Rule لے لو"۔ غرض "سب کچھ منظور ہے مگر بات نہیں ہو گی تو یروشلم کے بارے میں، یہ ہمارا اٹوٹ انگ ہے"۔

میرے نزدیک تو شاید چند سال کی بات ہے کہ مسجد اقصیٰ گرا دی جائے گی۔ اس کی جگہ وہ ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ تقریباً دو ہزار سال سے ان کا یہ "کعبہ" گویا گرا پڑا ہے۔ اسرائیلی وہاں جاتے ہیں اور رو دھو کر واپس آ جاتے ہیں۔ وہاں جا کر اسرائیلی دیوار گریہ سے سر ٹکراتے ہیں۔ اگرچہ یہ ٹکریں Symbolic ہوتی ہیں تاہم movement تو ایسی ہی ہوتے ہیں جیسے کہ سچ مچ کی ٹکریں مار رہے ہوں۔ اب وہ اسے تعمیر کریں گے۔ مسجد اقصیٰ اب ان کے لئے گرانا مشکل نہیں رہا۔ اس لئے کہ بابری مسجد گرا کر انہوں نے مسلمانوں کی نبض پر ہاتھ رکھ کر دیکھ لیا ہے کہ ان میں کوئی جان نہیں ہے۔ بس عالم عرب کے کچھ جوشیلے نوجوان احتجاج کے لئے کھڑے ہوں گے۔ انہیں بھونے کے لئے اسرائیل کو اپنی گولیاں بھی ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لئے حسنی مبارک موجود ہے، شاہ فہد صاحب ہیں، اور بھی جو اردن اور مراکش کے بادشاہ اور الجزائر کے ڈکٹیٹر ہیں۔ اس فہرست میں اب پی۔ ایل۔ او کے صدر یاسر عرفات کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس ساری گفتگو سے نتیجہ یہ نکال رہا ہوں کہ New World Order جو درحقیقت Jew World Order ہے وہ ایک وقت تو قائم ہو گا، لیکن قائم ہونے کے بعد ا

Just World Order of Islam میں بدلنا اگلا قدم ہو گا۔

اس تبدیلی کو ایک مثال سے سمجھ لیجئے' فرض کیجئے آپ کو سو آدمیوں کو مسلمان بنانے کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے۔ اب اگر یہ سو آدمی بالفرض ایک آدمی کی شکل اختیار کر لیں یا کسی ایک آدمی کا مسلمان ہونا سب کے مسلمان ہونے کا وسیلہ بن جائے تو آپ کا کام کتنا آسان ہو جائے گا۔ اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھئے دنیا عالمی نظام کی طرف جا رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عالمی نظام کو اسلام کی طرف لانا صرف ایک shift over کی بات رہ جائے گی۔ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبر کی صداقت ثابت ہو جائے گی۔ وہ اسلام کا عالمی نظام ہو گا۔ اور اسی نظام کو حضور ﷺ نے "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کا نام دیا ہے۔

دورِ سعادت سے پہلے

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ بہت ہی خوش آئند ہے کہ اللہ کا دین پورے کرۂ ارض پر غالب ہو گا۔ لیکن اس عظیم کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے پہلے کن دردناک حالات سے گزرنا ہو گا اور گوہر بننے سے قبل قطرے پر کیا کچھ گزرے گی' یہ دردناک باب ہے۔ اس کی خبریں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دی ہیں۔ افسوس کہ احادیث کی طرف ہمارا دھیان ہی نہیں ہے۔ عوام کا تو خیر ذکر ہی کیا کئی علماء نے بھی مجھے بتایا کہ "یہ جو کتب احادیث کے آخر میں "کتاب الفتن" "کتاب الملاحم" اور "علامات الساعۃ" کے عنوان سے ابواب آتے ہیں ہم انہیں پڑھتے ہی نہیں۔ علماء کا سارا زور احادیث کے فقہی مباحث پر صرف ہوتا ہے۔ حالانکہ احادیث صحیحہ اور متواترہ میں جو خبریں اور پیشین گوئیاں موجود ہیں ان سے صرفِ نظر کا کیا جواز ہے! بات یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی علیہ اللعنۃ نے احادیث نزول مسیح علیہ السلام کی جو توجیہہ کی اور پھر خود ہی مسیح بن بیٹھا اس سے عام مسلمان کہتے ہیں کہ ان باتوں کو سرے سے چھوڑ ہی دو' ان میں پڑنے کی ضرورت کیا ہے جس سے اہل فتنہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جبکہ یہ باتیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں بہت اہم ہیں' ان سے استغناء برتنا گویا محمد رسول اللہ ﷺ کے متعدد

مرتبہ کو کم کرتا ہے۔ بہرحال احادیث مبارکہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو آنے والا وقت مغربی سامراج کی غلامی سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔

میں اپنی بات کو اگر ایک جملے میں بیان کروں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ عالمی خلافت سے قبل دو مسلمان امتوں کو ان کی سزاؤں کی آخری قسط ملنی ہے۔ اس جملے کی مختصر تشریح کے سلسلے میں پہلا سوال تو یہی ہے کہ وہ دو مسلمان امتیں کون سی ہیں؟ تو ذرا سورۂ نور کی آیت ۵۵ جس کا حوالہ پہلے آ چکا ہے' اس پر ایک نظر ڈالئے۔ اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

﴿...لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم...﴾

"...ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے..."

° دنیا پہلے بھی ایک امت مسلمہ تھی۔ اور دوسری اہم بات: غلط مفہوم نہ لیا جائے تو عرض کروں گا کہ بعض اعتبارات سے سابقہ امت مسلمہ ہم سے افضل تھی۔ جس طرح جزوی فضیلت تو کسی نبی کو حاصل ہو سکتی ہے لیکن کلی اور مطلق فضیلت حضور ﷺ ہی کو حاصل ہے۔ چنانچہ سابقہ امت مسلمہ کے لئے قرآن حکیم میں دو جگہ ارشاد ہوا ہے۔

﴿وانی فضلتکم علی العٰلمین﴾ (البقرہ ۴۷ و ۱۲۲)

"میں نے تم کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی"۔

جبکہ ہمارے لئے جو الفاظ آئے ہیں وہ صرف یہ ہیں:

﴿وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطا﴾ (البقرہ ۱۴۳)

"اور ہم نے تم کو "امت وسط" بنایا"۔

دونوں آیات کے تیور اور کلمات کے فرق کو دیکھئے!

اس کے علاوہ یہ پہلی امت وہ امت ہے جس میں ۱۴ سو برس تک نبوت کا سلسلہ نہیں ٹوٹا۔ ۱۴ سو قبل مسیح دو رسولوں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے یہ [illegible]

زنجیر شروع ہوئی اور اس زنجیر کے اختتام پر بھی دو ہی نبی حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام موجود تھے۔ اس آخری زنجیر کے درمیان جب بھی کوئی نبی فوت ہوا تو کوئی نبی اس کا جانشین بنا۔ اس سابقہ امت کی تاریخ ۱۴ سو برس پر محیط ہے۔ چودہ سو سال قبل مسیح میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات ملی تھی۔ بنی اسرائیل تو پہلے بھی موجود تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نبی تھے۔ حضرت موسیٰ اور ان کے درمیان کسی نبی کا تذکرہ نہیں ملتا۔ لیکن بنی اسرائیل کے ۱۲ قبیلے تو موجود تھے۔ پھر تورات ملنے کے بعد ان کو امت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا﴾ (بنی اسرائیل: ۲)

"اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کتاب کو بنی اسرائیل کا رہنما بنایا کہ (دیکھو) میرے سوا کسی کو سرپرست نہ بنانا"۔

"گویا یہاں سے امت کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔

اس امت کو ایک ہی کتاب نہیں دی گئی بلکہ کئی کتابیں دی گئیں۔ دو کتابیں تو وہ ہیں جن پر ہمارا بھی ایمان ہے، زبور اور انجیل۔ ان کے علاوہ متعدد صحیفے بھی عطا کیے گئے۔

یہ ہے وہ سابقہ امت مسلمہ جس کی فضیلت کے لیے قرآن حکیم میں مذکورہ بالا آیت دو مقام پر آئی ہے۔ بالکل اسی طرح دو ہی دفعہ یہ مضمون بھی آیا ہے

﴿ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾

(البقرہ: ۶۱، آل عمران: ۱۱۲)

"ان پر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے"

ایک طرف ان کو یہ فضیلت دی گئی اور دوسری طرف یہی قوم مغضوب و ملعون قرار پائی۔ سورۂ فاتحہ کے کلمات "مغضوب علیھم" کی تفسیر میں سب متفق ہیں کہ ان سے مراد یہود ہیں اور "الضالین" سے مراد نصاریٰ ہیں۔ قرآن حکیم میں آتا ہے

﴿لُعِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ

وعیسی ابن مریم ....﴾ (المائدہ: ۷۸)

"داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبانی بنی اسرائیل میں سے ان لوگوں پر لعنت کی گئی جنہوں نے کفر کیا"۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ دراصل اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کے کچھ قوانین ہیں جن کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قانونِ عذاب کے سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ یہ دنیا افراد کے لئے دار الجزاء نہیں ہے، بلکہ قوموں کے لئے دار الجزاء ہے۔ افراد کے لئے عذاب و ثواب کا فیصلہ آخرت میں ہوگا۔ آخرت میں ہر شخص انفرادی حیثیت میں آئے گا۔ لیکن اقوام کے گناہوں کا حساب اکثر اس دنیا میں ہی چکا دیا جاتا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!

پھر قوموں پر دو طرح کے عذاب آتے ہیں۔ ایک بڑا عذاب، جسے قرآن مجید "العذاب الاکبر" کہتا ہے۔ اسے عذابِ استیصال بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس عذاب میں قوموں کا نام و نشان مٹا دیا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ یہ عذاب صرف ان قوموں پر آتا ہے جن کی طرف کسی رسول کو مبعوث کیا گیا ہو اور قوم نے بحیثیت مجموعی رسول کی دعوت کو ٹھکرا دیا ہو۔ قومِ نوحؑ، قومِ صالحؑ، قومِ ہودؑ، قومِ شعیبؑ، قومِ لوطؑ اور آلِ فرعون اسی عذابِ استیصال سے دوچار ہوئے۔ اور یہ چھ مثالیں قرآن مجید میں بہ ترتیب بیان کی گئی ہیں۔

اس سے کمتر درجے کا عذاب آتا ہے اس مسلمان امت پر جو زمین پر اللہ کی نمائندہ ہونے، حاملِ کتابِ الٰہی ہونے اور وارثِ علومِ نبوت ہونے کے باوجود اپنے عمل سے اپنے دعووں کی تکذیب شروع کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑا جرم کوئی نہیں۔ باقی نوعِ انسانی کی گمراہی اور جرائم کی ذمہ دار بھی یہی قرار پاتی ہے۔ کیونکہ پیغامِ حق پہنچانا اس کا فرض تھا۔ اگر وہ یہ پیغامِ حق بے کم و کاست پہنچا دیتی اور پھر دنیا نہ مانتی تب تو انکار کرنے والے مجرم قرار پاتے اور وہ امت بری الذمہ ہو جاتی۔ مگر جب اس امتِ مسلمہ نے

پہنچانے کا فرض ادا نہیں کیا تو اب مجرم وہ خود بن گئی کہ اللہ کی زمین پر اس کی نمائندگی کی دعویدار بھی ہے اور عمل اس کے برعکس ہے۔ اس سے بڑا جرم اور کوئی نہیں۔ اسی کی پاداش میں وہ عذاب ہے جو بنی اسرائیل پر آیا اور جو امت محمدؐ پر آیا۔

اس موقع پر میں ایک عظیم حدیث مبارکہ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ یہ حدیث دراصل بہت بڑے خزانے کی کلید ہے۔ اس کے راوی حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میری امت پر وہ سارے حالات وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر وارد ہوئے بالکل ایسے جیسے ایک جوتی کا تلا دوسری جوتی کے بالکل مشابہ اور برابر ہوتا ہے"۔ "حضور کی فصاحت و بلاغت کی انتہا ہے۔ جوتی کا جوڑا اگر اوپر سے دیکھا جائے تو ان کے چھوٹے بڑے ہونے کا فرق نظر نہ آئے گا لیکن جب ان کے تلے جوڑ کر دیکھا جائے گا تو جوڑی کا فرق معلوم ہو جائے گا۔ اور اگر صحیح جوڑی ہوئی تو دونوں کے تلوں میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

تاریخ کے مطالعہ سے اس حدیث کے کلید ہونے کی حیثیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ نبی ﷺ کی بعثت تک بنی اسرائیل پر دو عروج کے دور آ چکے تھے اور زوال کے بھی دو ہی دور بیت چکے تھے۔ سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں ان دو ادوار کا ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿وقضینا الی بنی اسراءیل فی الکتب لتفسدن فی الارض
مرتین ولتعلن علوا کبیرا ۝﴾

پہلے آشوریوں کے ہاتھوں اسرائیل کی حکومت ختم ہوئی۔ اس کے بعد کلدانیوں کے ہاتھوں تباہی آئی۔ چھ سو برس قبل مسیح بخت نصر کے ہاتھوں چھ لاکھ انسان یروشلم میں قتل ہوئے اور چھ لاکھ کو وہ قیدی بنا کر لے گیا۔ یروشلم میں ایک شخص نہیں چھوڑا۔ ہیکل سلیمانی کو مسمار کر کے ہموار کر دیا۔ اس کی بنیادیں تک کھود کے پھینک دیں۔ اس کے بعد حضرت عزیر علیہ السلام نے توبہ کی دعوت و منادی دی، جس پر یہ جاگے اور اللہ کے حضور توبہ کی۔ تب سائرس کے ہاتھوں اللہ نے بابل کی اسیری سے نجات دلائی۔ اس کے بعد یہ یروشلم آئے اور ہیکل سلیمانی، جو ان کے ہاں کعبے کا درجہ رکھتا ہے، دوبارہ تعمیر کیا۔ یہ

ان کا دوسرا دور عروج ہے۔ لیکن انہوں نے پہلے کی طرح پھر کتاب اللہ کو پیٹھ دکھائی' عیاشیوں اور بدمعاشیوں میں مبتلا ہوئے اور طاؤس و رباب میں غرق ہو کر تباہی کے اسی راستے پر چل پڑے جس کو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے ؂

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول' طاؤس و رباب آخر

لہٰذا پھر عذاب کا کوڑا برسا۔ یہ عذاب کا کوڑا پہلے یونانیوں' پھر رومیوں کے ہاتھوں برسا۔ پہلے دور میں سزا آشوریوں کے ہاتھوں آئی جو شمال سے آئے تھے' پھر مشرق سے کلدانی آئے۔ بخت نصر بابل کا بادشاہ تھا۔ دوسرے دور میں پہلے عذاب کے کوڑے یونانیوں کے ہاتھوں برسے اور پھر رومیوں کے ہاتھوں۔ ۷۰ء میں ٹائٹس رومی نے جو حملہ کیا اس میں ایک لاکھ تینتیس ہزار یہودی ایک دن میں قتل ہوئے۔ باقی یہودیوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ اس وقت کے بعد سے اب جا کر اس صدی میں انہیں اپنا گھر نصیب ہوا ہے۔ یروشلم میں ان کا داخلہ بند تھا۔ جب حضرت عمرؓ کے ہاتھوں بیت المقدس فتح ہوا تب جا کر یروشلم میں داخلے کی اجازت ملی۔ حضرت عمرؓ نے اسے "Open City" قرار دیا ورنہ پورے ساڑھے پانچ سو برس تک کوئی یہودی اپنے مقدس شہر میں داخل بھی نہ ہو سکا تھا۔ بہرحال یہ ہے اس وقت تک کی تاریخ جب آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی۔

بنی اسرائیل کے عذاب استیصال میں تاخیر کی وجہ

حضرت مسیح علیہ السلام ان کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ سورۃ آل عمران (آیت ۴۹) میں ہے : ورسولا الی بنی اسراء یل (یعنی بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے رسول) انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت کو رد کر دیا بلکہ اپنی طرف سے تو گویا ان کو سولی پر چڑھا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ان کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا' لہٰذا اسی وقت سے یہ قوم عذاب استیصال کی مستحق ہو چکی ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل ہی کے دوسرے رکوع میں آیا ہے :

﴿وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا﴾ (بنی اسرائیل : ۱۵)

> یعنی "ہم اس وقت تک عذاب (استیصال) نہیں نازل کرتے جب تک ہم اپنا رسول نہ بھیج دیں"۔

جیسا کہ واضح کیا گیا، رسول آ چکا اور انہوں نے اس کو رد بھی کر دیا۔ لیکن ایک خاص سبب سے اس قوم پر اس طرح کے عذاب کی نہ اس وقت تنفیذ ہوئی نہ اب تک ہوئی۔ بات یہ ہے کہ قرآن حکیم نے نبی ﷺ کی بعثت کی شکل میں ان کے لئے ایک رحم کی اپیل (Mercy Appeal) کا موقع پیدا کیا۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے:

> ﴿عسٰی ربکم ان یرحمکم، وان عدتم عدنا، وجعلنا
> جہنم للکافرین حصیرا ۝ ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی
> اقوم ویبشر المومنین الذین یعملون الصالحات ان لھم
> اجرا کبیرا﴾ (بنی اسرائیل : ۸-۹)

یعنی "اب بھی دامن محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں پناہ لے لو، قرآن پر ایمان لے آؤ، جو ہر معاملے میں سیدھا راستہ دکھانے والی کتاب ہے، ہم اب بھی تم پر رحم فرمانے کے لئے تیار ہیں"۔ افسوس! یہود نے اس Mercy Appeal کا موقع بھی گنوا دیا۔ لیکن اس کے باوجود "العذاب الاکبر" کی Execution نہیں ہوئی۔ کیوں نہیں ہوئی؟ یہ اس داستان کا تلخ حصہ ہے۔ اس لئے کہ پہلے موجودہ مسلمان امت کے افضل حصہ (عالم عرب) کی پٹائی اس مغضوب اور ملعون قوم کے ہاتھوں کروانی ہے۔

امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کی تاریخ

اب ہم اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں امت مسلمہ کی تاریخ کے مختلف ادوار کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس امت پر بھی بعینہ عروج و زوال کے وہی چار دور آ چکے ہیں جو تاریخ بنی اسرائیل کے حوالے سے بیان کئے گئے ہیں۔ امت مسلمہ کا پہلا دورِ عروج عربوں کی زیر قیادت آیا۔ اس پہلے دور میں خلافت راشدہ کا سنہری دور بھی شامل ہے۔ اس کے بعد خلافت راشدہ ختم ہو گئی مگر مسلمانوں کی حکومت موجود رہی۔ اس کے بعد پہلا دورِ زوال صلیبیوں کے ہاتھوں آیا۔ ۱۰۹۹ء میں یروشلم ہاتھ سے نکل گیا اور لاکھوں مسلمان قتل

ہوئے۔ اس کے بعد ۱۲۵۸ء میں وہ فتنہ تاتار آیا جس میں کروڑوں مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ ان کی عظیم مملکت تہس نہس کر دی گئی ---- ۱۲۵۸ء میں بغداد کا سقوط ہوا۔ بنو عباس کے آخری خلیفہ کو محل کے اندر سے گھسیٹ کر نکالا گیا اور جانور کی کھال میں لپیٹ کر گھوڑوں کے سموں تلے کچلوا دیا گیا۔ حضرت شیخ سعدیؒ نے مرثیہ کہا تھا :-

آسماں را حق بود گر خوں بیارد بر زمیں
بر زوالِ مُلکِ مستعصم امیر المومنیں

(امیر المومنین مستعصم کی سلطنت کے زوال پر آسمان کو حق ہے کہ وہ زمین پر (خون کے) آنسو برسائے)

دیکھئے دونوں امتوں کی تاریخ میں کتنی گہری مشابہت ہے' یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کاربن کاپی ہو۔ وہاں پہلے شمال سے آشوری آئے تھے جبکہ یہاں پہلے یورپ یعنی شمال سے صلیبی آئے۔ وہاں مشرق سے کلدانی آئے تھے جبکہ یہاں مشرق سے تاتاری آئے۔ وہاں لاکھوں انسانوں کا خون بہا' یہاں کروڑوں انسان تہ تیغ ہوئے (موجودہ امت مسلمہ کی وسعت کے لحاظ سے اس کے کروڑوں پرانی امت مسلمہ کے لاکھوں کے برابر ہی ہیں)

اس زوال کے بعد ہمارا دوسرا دورِ عروج شروع ہوا ؂

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

یعنی اللہ نے مسلمانوں کو جن کے ہاتھوں پٹوایا تھا انہی کے ہاتھ میں اپنے دین کا پرچم تھما دیا۔ یہ دوسرا عروج' سلطنت عثمانیہ کا دور ہے۔ چار سو برس تک خلافت کا یہ ادارہ قائم رہا۔ اسے گویا بنی اسرائیل کی مکابی سلطنت کا دور سمجھئے۔ پھر تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔

سابقہ امت مسلمہ پر بھی عذاب کا دوسرا مرحلہ یورپی اقوام کے ہاتھوں آیا تھا' موجودہ امت پر بھی یورپی سامراج (European Imperialism) کا تسلط ہوا۔ سابقہ امت مسلمہ پر پہلے یونانی حملہ آور ہوئے پھر رومی آئے جبکہ ہم پر ولندیزی' انگریز اور اطالوی قوموں نے تسلط پایا۔

جو چار ادوار سابقہ امت مسلمہ پر نبی اکرم ﷺ کی بعثت تک مکمل ہوئے تھے وہ اس امت پر رواں صدی کے آغاز میں پورے ہو گئے۔ سابقہ امت مسلمہ کے لئے بھی کہہ دیا گیا تھا کہ "وان عدتم عدنا" (بنی اسرائیل : ۸) (اگر تم باز نہیں آؤ گے تو ہم تم کو سزا پر سزا دیتے رہیں گے) چنانچہ ان کی سزا جاری رہی یہاں تک کہ صرف اسی صدی میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کو ہٹلر نے قتل کیا۔ انسانی تاریخ میں پہلے اس طرح کبھی نہیں ہوا کہ انسانی لاشوں کو ٹھکانے کرنے کے لئے پلانٹ بنائے گئے ہوں۔ ایک طرف سے لوگ gas chamber میں داخل ہو رہے ہیں' کپڑے اتروا لئے گئے ہیں' ننگے داخل کئے جا رہے ہیں' مرتے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد پٹوں کے اوپر لاشیں جا رہی ہیں اور آگے جا کر مشینیں ان لاشوں کو چارے کی طرح کاٹ رہی ہیں--- بعد میں انہیں کیمیکل سے treat کیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ اتنی لاشوں کو ٹھکانے (dispose off) کیسے لگایا جائے۔ کون اتنی قبریں کھودے اور کون جلانے کی مصیبت اپنے سر لے۔ آخر میں ان پلانٹوں سے ایک سیاہ بدبودار مائع نکلتا تھا جس کو وہ اپنے کھیتوں میں کھاد کے طور پر پہنچا دیتے تھے!

یہ سب اسی صدی کی بات ہے!!

آنے والے عذاب کی جھلک

اس ضمن میں جو تلخ ترین بات مجھے کہنی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی "کاربن کاپی" ابھی امت مسلمہ پر آنے والی ہے۔ اس لئے کہ حضور ﷺ کی حدیث جھوٹی نہیں ہو سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ اللہ نے ہم کو مغربی استعماریت سے نجات دلا دی ہے لیکن ہم اب زیادہ بڑے امتحان میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ پہلے تو (بطور عذر) ہم کہہ سکتے تھے کہ ہم انگریزوں' فرانسیسیوں اور اطالویوں کے غلام ہیں' اب تو غلامی ختم ہو گئی ہے۔ لیکن غلامی کے خاتمے کے باوجود دنیا میں کوئی مسلمان ملک بھی ایسا نہیں ہے جس نے اس نظام کو قائم کر دیا ہو جو محمد رسول اللہ ﷺ کی امانت و وراثت کی حیثیت سے ہمارے پاس ہے۔ لہٰذا امتحان میں اس ناکامی کا نتیجہ تو نکلنا ہی ہے۔

خروج دجال بھی سامنے کی بات ہے۔ یہودیوں کو ابھی عظیم تر اسرائیل قائم کرنا

ہے۔ اسکے قبضے میں تقریباً آدھا جزیرہ نمائے عرب موجود ہے۔ مدینہ سمیت مصر کے پورے زرخیز علاقے پر ان کا دعویٰ ہے۔ عراق میں وہ اسیری میں رہے ہیں اس لئے اس پر بھی ان کا دعویٰ ہے اور شام تو ان کی ارض موعود ہے۔ ترکی کا مشرقی حصہ بھی ان کے نقشے میں شامل ہے۔ ایک طرف ان کے یہ عزائم ہیں اور دوسری طرف کوئی مزاحمت سرے سے موجود ہی نہیں۔ عالم عرب میں سے کس میں دم ہے؟ عراق کے کچھ "ایٹمی دانت" نکلنے کا اندیشہ ہو گیا تھا لہٰذا اسرائیل نے سعودی عرب کی فضائی حدود سے گزر کر عراق کے ایٹمی ری ایکٹر تباہ کر دیئے اور جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ خلیج کی جنگ میں نکل گئی۔ امریکی فوجی جنرل شوارزکوف نے صاف کہا ہے کہ ہم نے جنگ لڑی ہی اسرائیل کی حفاظت کے لئے ہے۔

نزول مسیحؑ اور خروج دجال

حدیث مبارکہ میں جس "الملحمۃ العظمیٰ" (جنگ اعظم) کا ذکر ہے اس کے بارے میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ اتنے انسان قتل ہوں گے کہ ایک پرندہ اڑتا چلا جائے گا لیکن اسے سوائے لاشوں کے اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔ یہاں تک کہ وہ تھک ہار کر گرے گا تو لاشوں پر ہی گرے گا۔

الملحمۃ العظمیٰ، خروج دجال اور دجالی فتنہ سے مراد کیا ہے؟۔ ایک چیز دجالی فتنہ ہے "اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ اس فتنے میں تو ہم سب اس وقت مبتلا ہیں۔ ایک "المسیح الدجال" ہے۔ یہ درحقیقت ایک یہودی ہو گا۔ اس کا دعویٰ یہ ہو گا کہ "میں مسیح ہوں"۔ یہ دعویٰ اس بنیاد پر کرے گا کہ یہود کے ہاں حضرت مسیحؑ کے بارے میں پیشین گوئیاں موجود تھیں۔ یہودی ان کو اپنا نجات دہندہ مانتے آ رہے تھے۔ وہ نجات دہندہ حضرت مسیحؑ ابن مریم تھے جن کی بعثت ہو بھی چکی لیکن یہود نے ان کا انکار کر دیا بلکہ اپنی طرف سے تو گویا ان کو سولی پر ہی چڑھا دیا۔ لہٰذا ان کی جگہ یہود کے خیال میں اب بھی خالی ہے۔ اب کوئی شخص یہود میں سے عظیم تر اسرائیل قائم کرنے کا عزم مصمم لے کر اٹھے گا۔ اس کے راستے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ صدام حسین کو تو امریکہ نے

اس لئے رکھا ہوا ہے کہ اگر اسے ہٹایا گیا تو پھر ایران کو آگے بڑھنے سے روکنے والی کوئی طاقت نہ رہے گی۔ صدام حسین اگر اب تک کرسی اقتدار پر ہے تو کوئی اپنی طاقت سے تھوڑا ہی ہے بلکہ اس کی اپنی تو کوئی حیثیت نہیں۔

اس طرح خود یہود میں سے خروج دجال ہوگا اور پھر "خونِ اسرائیل" نہیں خونِ اسمٰعیل جوش میں آئے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ' جو اولادِ اسمٰعیل میں سے ہیں ' کی امت سے وہ عظیم قائد اٹھے گا جو مہدی کے نام سے مشہور ہے (اگرچہ مہدی اس کا نام نہیں صفت ہے)۔

میں نے دانستہ "ظہور مہدی" کے الفاظ کے بجائے "عظیم قائد" کا لفظ استعمال کیا ہے تا کہ اہل تشیع کے امام غائب کے ظہور کی طرف اشارہ نہ سمجھا جائے۔ ہمارے نزدیک عالم عرب سے ایک قائد ابھرے گا۔ اس کی قیادت میں مسلمان صالحین وہ جنگ کریں گے کہ آسمان سے بھی مدد آئے گی۔ حضرت عیسیٰ کا نزول ہوگا اور یہ اصل عیسیٰ ہوں گے جو اس جعلی مسیح کو مقام لد پر قتل کریں گے۔ یہی وہ مقام ہے جو اس وقت "لدا" کے نام سے اسرائیل کا سب سے Air Baselz ہے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ صلیب توڑ دیں گے گویا صلیب کا عقیدہ ختم کر دیں گے۔ وہ کہیں گے کہ مجھے تو کسی نے صلیب پر نہیں چڑھایا تھا' مجھے تو اللہ لے گیا تھا' اللہ ہی نے دوبارہ اتار دیا۔ تمہارا یہ عقیدۂ صلیب باطل ہے۔ اس کے علاوہ آپ خنزیر کو قتل کر دیں گے گویا خنزیر کو حرام قرار دے دیں گے۔ پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہوگا۔

لیکن اس سے پہلے بہت بڑی سزا امت محمدؐ بالخصوص اس کے سب سے افضل حصے کو مل کر رہے گی۔ اس اصول پر کہ ؏

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

عربوں کا رتبہ بلند ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہی میں سے تھے۔ پھر اللہ کی آخری کتاب ان کی زبان میں نازل ہوئی۔ ہمیں قرآن سمجھنے کے لئے بڑی محنت کرنی ہوتی ہے جبکہ عربی ان کی مادری زبان ہے۔

دنیا کے ایک ارب تیس کروڑ مسلمانوں میں سے ایک ارب کی تعداد میں غیر عرب ہیں جبکہ عربوں کی تعداد پچیس کروڑ سے زیادہ نہیں ہے۔ غیر عرب مسلمانوں میں سے چالیس کروڑ تو جنوبی ایشیا، برعظیم پاک و ہند میں رہتے ہیں۔ ان چالیس کروڑ میں سے دس کروڑ مسلمانان پاکستان ہیں۔ دس گیارہ کروڑ بنگلہ دیش میں ہوں گے جبکہ بھارت میں کم از کم اٹھارہ کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ عالم اسلام میں ثقافتی مراکز بھی دو ہی رہے ہیں۔ عربوں کے لئے ثقافتی مرکز مصر اور عجمی مسلمانوں کے لئے یہ برعظیم رہا ہے۔ ایک ہزار سال تک سارے مجددین عالم عرب میں پیدا ہوئے جبکہ چار سو سال سے سارے مجددین برعظیم پاک و ہند میں پیدا ہوئے۔

اسلام کے نام پر تحریک اسی برصغیر میں چلی جس کا نتیجہ قیام پاکستان ہے۔ میں پاکستان کے بارے میں گومگو کی کیفیت میں ہوں۔ ایک اعتبار سے پوری امت مسلمہ میں عربوں کے بعد سب سے بڑے مجرم ہم ہیں۔ اس لئے کہ ان کے بعد فضل بھی سب سے زیادہ ہم پر ہی ہوا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں عظیم شخصیات یہیں سے ابھریں۔ علامہ اقبال جیسا مفکر یہاں پیدا ہوا، جس کے پائے کی شخصیت پورے عالم اسلام میں پیدا نہیں ہوئی۔ پوری دنیا میں صرف یہی ایک ملک ایسا ہے جو اس دور میں اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا۔ پاکستان کا قیام معجزے سے کم نہیں ہے۔ چند مہینے پہلے جو گاندھی یہ کہہ رہا تھا کہ پاکستان میری لاش پر ہی بن سکتا ہے، اسے پاکستان کو تسلیم کرنا پڑا۔ بہرحال پاکستان کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ

"Hope for the best and be prepared for the worst"

(امید بہترین کی رکھو لیکن بد ترین (حالات) کے لئے تیار رہو)

پاکستان میں خلافت کا احیاء

تاہم ایک بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ خلافت کا احیاء شروع یہیں سے ہوگا۔ اس لئے کہ پوری اسلامی دنیا میں صرف اور صرف یہ ملک ایسا ہے جس میں قرارداد مقاصد منظور ہوئی اور دس کروڑ عوام کی اسمبلی نے اعلان کیا کہ ہم حاکمیت سے دستبردار

ہوتے ہیں۔ حاکمیت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ ہمارے پاس جو بھی اختیارات ہیں وہ ایک امانت ہیں اور یہ انہی حدود کے اندر اندر استعمال ہوں گے جو اصل حاکم نے مقرر کر دی ہیں۔ دنیا کے باقی تمام ممالک کے دساتیر میں زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ کسی ملک کے سرکاری مذہب کا نام اسلام لکھ دیا گیا ہے جو بہت محدود اور مبہم بات ہے۔

تبدیلی تو یہیں سے آئے گی لیکن اس تبدیلی کی عملی صورت یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ "Hope for the best" کے مصداق یعنی اللہ تعالیٰ ہمیں توبہ کی توفیق دے دے اور بغیر کسی مزید عذاب اور سزا کے ہم اللہ کی طرف لوٹ آئیں۔ اور یہ توبہ کرنے والے اتنی معتد بہ تعداد میں ہوں جو جمع ہو کر یہاں پر انقلاب برپا کر دیں۔ محدودے چند افراد کی توبہ سے ظاہر ہے کہ کام نہیں چلے گا۔ اگرچہ اس توبہ کا آغاز بہر حال افراد سے ہو گا کہ ؎

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا!!

مگر کیا اجتماعی توبہ کی یہ توفیق ہم کو نصیب ہو گی؟ عذاب کا ایک کوڑا ہم پر چھتیس سال پہلے برس چکا ہے۔ مگر ہم ایک بار پھر اس عذاب کے مستحق بن چکے ہیں۔ تاریخ سے ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ عذاب کا وہ کوڑا کوئی معمولی تو نہ تھا۔ بدترین شکست ہوئی' پاکستان دو لخت ہوا' ۹۳ ہزار فوجی اور سویلین اس ہندو کی قید میں گئے جس پر ہم نے آٹھ سو برس تک حکومت کی تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہم کو مزید مہلت دی مگر افسوس! حالات اس طرف جا رہے ہیں کہ کہیں تاریخ پھر اپنے آپ کو نہ دہرائے۔ کسی قوم پر جب عذاب کے آثار شروع ہو جاتے ہیں تو پھر وہ ٹلا نہیں کرتا۔ پوری انسانی تاریخ میں اس کی واحد مثال حضرت یونس علیہ السلام کی قوم ہے جس نے عذاب کے نمایاں آثار دیکھ کر اجتماعی توبہ کی اور اس کے نتیجے میں آتا ہوا عذاب ٹل گیا۔ یہی ایک راستہ مسلمانان پاکستان کے لئے بھی ہے کہ اجتماعی توبہ کرتے ہوئے اللہ کے ساتھ کئے گئے عہد و پیمان کو پورا کریں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اندیشہ ہے کہ کوئی پہلے سے بھی زبردست کوڑا ہماری پیٹھ پر برسے گا۔

تبدیلی کی دوسری عملی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ عذاب کے اس دوسرے کوڑے کے بعد ہم ہوش میں آ جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بڑا مبارک کوڑا ہو گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے :

"ولنذیقنھم من العذاب الادنی دون العذاب الاکبر لعلھم
یرجعون" (السجدہ : ۲۱)

"ہم انہیں آخری بڑے عذاب سے قبل چھوٹے عذاب کا مزا چکھائیں گے
شاید کہ وہ لوٹ آئیں"۔

اسی چھوٹے عذاب کا ایک کوڑا ہم پر پڑا تھا لیکن دو ہزار میل دور ہونے کی وجہ سے ہم نے محسوس ہی نہیں کیا۔ کتنے لوگ مرے، کتنی عصمتیں لٹیں اور کتنے گھر اجڑ گئے، اس کا ہمیں اندازہ ہی نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ڈھائی تین لاکھ پاکستانی ابھی تک وہیں پڑے ہیں اور جانوروں سے بدتر حالت میں ایک ایک کوٹھری میں پندرہ پندرہ انسان رہ رہے ہیں اگر ہم بہرحال مکمل تباہی سے بچ گئے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے تازہ مہلت عمل (Fresh lease of existance) عطا کر دی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نکسن کا دل موڑ دیا، اس نے Hot line پر بھارت کو ultimatum دے ڈالا۔ کوسیگن نے بھی اندرا گاندھی کو حکم جاری کر دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خصوصی مداخلت نہ ہوتی تو پھر جو تباہی آنی تھی اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا morale تو آسمان پر تھا جبکہ ہمارا پاتال میں۔ ہماری فضائیہ مفلوج ہو چکی تھی۔ ہمارے جہاز تو حرکت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ روس کے دیئے ہوئے اواکس طیارے بھارت کو پاکستان میں اڑنے والی چڑیا کی بھی خبر دے رہے تھے۔ وہ ہماری بحریہ کو کھاڑی میں مار کر چلے گئے تھے۔ ہمارا land defence ٹوٹ چکا تھا سوائے ہیڈ سلیمانکی کے۔ شکر گڑھ اور راجستھان میں ہمارا محاذ ٹوٹ چکا تھا۔ ان حالات میں امریکہ اور روس کے صدور کی مداخلت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلوں کو پھیرنے کی قوت کا ظہور اور مغربی پاکستان کا بچ جانا اللہ کی مشیت کا مظہر ہے۔

بھارت میں ہندو مت کا احیاء

پاکستان کی تبدیلی کے حوالے سے تیسری اور آخری بات بہت بھاری دل کے ساتھ

کہہ رہا ہوں۔ بھارت میں ہندو مت کا احیاء بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ ایودھیا کی مسجد گرانے کے لئے بھارت کے کونے کونے سے جو تین لاکھ کارکن پہنچے ہیں، ان کے ڈسپلن کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان کے کونے کونے سے آئے مگر مسلمانوں کو کہیں بھی گزند نہ پہنچایا۔ یہ کام ڈسپلن کے بغیر ممکن نہیں۔ نرے ہجوم کو قابو میں نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ اعلیٰ تربیت یافتہ اور منظم کارکن تھے۔ ان کا بس ایک ہی مقصد تھا، بابری مسجد کو منہدم کرنا۔ وہ گرائی اور واپس آ گئے۔ فسادات جو ہوئے بعد میں ہوئے، جب مسلمانوں نے احتجاجی تحریک چلائی۔

میں یہ حقائق چھ سال کے عرصے سے بتا رہا ہوں کہ آر ایس ایس میں ۲۵ لاکھ کارکن موجود ہیں۔ ان سب کا مقصد اسلام اور پاکستان کا خاتمہ ہے۔ حال ہی میں ان کے تیسرے گرو "دیوداس" نے ہندوستان کی تمام ہندو سماجی، علمی، سیاسی اور غیر سیاسی تنظیموں کو ایک سرکلر بھیجا ہے۔ اس میں اس نے کہا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ہندوستان کی زمین کو مسلمانوں کی نجاست سے پاک کر دیں۔ اس گرو نے مزید لکھا کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر کچھ رد عمل ہو گا تو وہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں ہو گا جس کی ہمیں پرواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ باقی پورے عالم اسلام میں کہیں رد عمل نہیں ہو گا۔ اس نے یہ الفاظ استعمال کیوں کئے ہیں کہ "میں تم کو یقین دلاتا ہوں...." اس لئے کہ ایودھیا کی مسجد کی تہدیم پر پورے عالم اسلام میں ان دو ممالک ----- پاکستان اور بنگلہ دیش ..... کے علاوہ کہیں رد عمل نہیں ہوا۔ کسی مسلمان ملک نے یہ تک نہیں کہا کہ مسجد دوبارہ تعمیر کرو ورنہ ہمارے تمہارے ساتھ تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ سفارتی تعلقات توڑنا تو دور کی بات ہے، اگر صرف امارات، سعودی عرب اور کویت کی یہ دھمکی آ جاتی کہ ہم تجارتی تعلق منقطع کر رہے ہیں تو بھارت کے ہوش ٹھکانے آ جاتے۔

یہ ہے تیسری صورت جو بدترین ہو گی۔

ایک طرف تو ہندو مت کا تیزی سے احیاء ہو رہا ہے اور دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ ہم بدترین انتشار کا شکار ہیں۔ تازہ الیکشن {۴۹} میں دینی، مذہبی سیاسی جماعتوں کا جو حشر ہوا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ لیکن کوئی پتہ نہیں کہ تاریخ ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو دہرا دے کہ ہندو قوم کے ہاتھوں ہم کو تہس نہس کرا دیا جائے لیکن اللہ تعالیٰ ان کو

اسلام لانے کی توفیق عطا کردے ۔

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

نظام خلافت کب اور کہاں برپا ہو گا؟

بہرحال ان تین صورتوں میں سے خواہ کوئی بھی پیش آئے ' مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ خلافت کا احیاء اسی خطے سے ہو گا۔ ایک سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے کہ یہ احیاء کب ہو گا؟ میں کیا جواب دوں گا جبکہ قرآن نے خود حضور ﷺ سے قیامت یا عذاب الٰہی کے بارے میں کہلوا دیا ۔

﴿وان ادری اقریب ام بعید ما توعدون O﴾ (الانبیاء : ۱۰۹)

"میں نہیں جانتا ۔ (جس بات کی تمہیں خبر دی جا رہی ہے) جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا دور" ۔

اسی طرح سورۃ جن میں آیا ہے :

﴿قل ان ادری اقریب ما توعدون ام یجعل لہ ربی امدا O﴾
(الجن : ۲۵)

یعنی "مجھے معلوم نہیں ہے کہ (جو خبر تم کو دی جا رہی ہے) جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب آ چکا ہے یا ابھی اس میں تمہارا رب کوئی تاخیر کرے گا" ۔

اسی خطے سے نظام خلافت کے احیاء کا یقین مجھے بہرحال حاصل ہے ۔ اب میں اس کی تائید میں دو حدیثیں پیش کر رہا ہوں ۔ ایک حدیث ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن حارث سے روایت کی ہے :

"مشرق سے قومیں نکلیں گی جو مہدی کی حکومت قائم کرنے کے لئے منزل بہ منزل مارچ کرتی آئیں گی ۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مشرق کے کسی علاقے میں وہ نظام خلافت پہلے قائم ہو چکا ہو گا ۔ دوسری حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے اور اس کو امام ترمذیؒ نے اپنی "جامع" میں روایت کیا ہے :

"خراسان کی جانب سے علم چلیں گے، ان کو کوئی روک نہ سکے گا جب تک کہ وہ ایلیاء میں جا کر نصب نہ ہو جائیں"۔

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یروشلم کا نام ایلیاء تھا) خراسان اس علاقے کا نام ہے جس کا کچھ حصہ اس وقت پاکستان میں ہے اور زیادہ حصہ افغانستان میں ہے۔ گویا یہی علاقے ہیں جہاں سے خلافت کا آغاز ہو گا۔

بظاہر بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی کیونکہ عربوں کے بعد سب سے بڑی مجرم قوم مسلمانان پاکستان ہیں۔ اس وقت پاکستان ننگے سیکولرازم کی طرف جا رہا ہے حتیٰ کہ قومی شناختی کارڈ پر مذہب کا خانہ تک درج نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ یہ بات عیسائیوں کو پسند نہ تھی۔ یہاں تک کہ مذہب کا خانہ ختم کرانے کے لئے پوپ صاحب بھی بول پڑے۔ یہ سب اس ملک میں ہو رہا ہے جو اسلام ہی کے نام پر معرض وجود میں آیا تھا۔

جیسا کہ اس سے پہلے واضح کر چکا ہوں کہ کتب احادیث میں "کتاب الفتن و کتاب الملاحم" سے مراد جنگوں کا باب ہے۔ ان میں خاص طور پر "الملحمۃ العظمٰی" کا ذکر ملتا ہے جو تاریخ انسانی کی عظیم ترین جنگ ہو گی۔ اس کے علاوہ احادیث میں علامات قیامت، خروج دجال، عرب میں قیادت مہدی کا ظہور، مشرق سے فوجوں کی آمد، آسمان سے حضرت مسیحؑ کا نزول، اس کے نتیجے میں یہود کا استیصال اور پھر عالمی سطح پر اسلام کے نظام خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی کہا ہے کہ یہ وہ حالات ہیں جو میرے اندازے میں تو زیادہ دور نہیں ہیں، قرائن و شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ بہت قریب پہنچ چکا ہے۔

ذات باری تعالیٰ کو کس نے دیکھا ہے۔ بس اس کی آیات ہی سے تو اسے پہچانا جاتا ہے"

حق مری دسترس سے باہر ہے
حق کے آثار دیکھتا ہوں میں

اسی طرح جو پیش آنے والے حالات ہیں اور قیامت سے قبل کی جو علامات ہیں، نبی اکرم ﷺ نے ان کو وضاحت سے بیان فرما دیا ہے۔ چنانچہ دیکھنے والے ان کو دیکھ رہے

ہیں۔ محسوس ہوتا ہے جیسے بساط بچھ رہی ہے' جیسے کسی ڈرامے کے لئے سٹیج تیار کیا جاتا ہے اور سامان فراہم کیا جاتا ہے۔

جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ درحقیقت دو مسلمان امتوں کی سزاؤں کی آخری قسطیں ہیں جو کہ اب آنے والی ہیں۔

حادثات اور واقعات کا ظاہر و باطن

ایک اصولی بات اور سمجھ لی جائے کہ تاریخ میں جو بڑے بڑے حادثات و واقعات رونما ہوتے ہیں ان کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ ظاہر میں کون کون سی قوتیں اور عوامل کار فرما ہیں' باطن میں اصل حقیقت کیا ہے اور مشیت ایزدی کس طور سے اپنا ظہور کر رہی ہے' یہ دو چیزیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ بسا اوقات ظاہری اعتبار سے جن چیزوں کی' جن واقعات و حادثات کی بہت اہمیت ہوتی ہے' باطنی اعتبار سے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اسی طرح باطنی اعتبار سے جن امور کی اہمیت ہوتی ہے وہ ظاہری اعتبار سے اہمیت کے حامل نظر نہیں آتے۔ اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ جن حالات میں نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی ہے اس وقت کی دنیا نے اس واقعہ کی اہمیت کو کیا سمجھا ہو گا؟ دنیا کے ایک چھوٹے سے کونے میں' جزیرہ نمائے عرب کے لق و دق صحرا میں ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ پھر اس واقعہ نے آگے چل کر وہاں انقلاب برپا کر دیا۔ مگر دنیا پر اس کا یا اس کے نتیجہ میں برپا ہونے والے انقلاب کا فوری اثر کیا ہوا ہو گا۔ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی دنیا میں آباد انسانوں کی اکثریت نے اس کا کیا نوٹس لیا ہو گا؟ لیکن معنوی اعتبار سے یہ کتنا اہم واقعہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انبیاء و رسل کے سلسلہ کا خاتمہ اور تکمیل ہے۔ اس بعثت کی وجہ سے روئے ارضی پر کتنا بڑا انقلاب برپا ہوا!؟ اگرچہ اس وقت کے حالات و واقعات میں کچھ دوسری قوتیں زیادہ موثر نظر آتی ہیں۔ حقیقت میں باطنی معاملہ تو "مشیت ایزدی" کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جو قانون ہے' اس کی جو سنت ہے۔ یہ واقعہ اس کا ظہور ہے اور جیسا کہ اس سے قبل کہا گیا مسلمان امتوں پر بھی عذاب آتا ہے اور کافروں سے بڑھ کر عذاب آتا ہے مگر کفار کے ضمن میں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ وہ

کافر جن کی طرف براہ راست کوئی رسول آیا ہو' اور رسول کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود وہ ایمان نہ لائیں تو ایسے کافروں کو کوئی رعایت نہیں ملتی۔ لیکن ان کے علاوہ وہ کفار جن پر کسی رسول نے براہ راست حجت پوری نہیں کی ان پر دنیا میں کوئی عذاب نہیں آتا۔ ان کا سارا معاملہ آخرت میں ہی چکایا جائے گا۔ اس دنیا میں سزا رسولوں کی امتوں کو ان کے اعمال اور قول و فعل کے تضاد کی بنیاد پر ملتی ہے۔ سورۂ صف آیت ۲ میں ہے :

﴿یاایها الذین امنوا لم تقولون ما لا تفعلون ○ کبر مقتا
عند الله ان تقولوا ما لا تفعلون ○﴾

"اے اہل ایمان کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ ناراضی کے لحاظ سے اللہ کے نزدیک یہ بات بہت بڑی ہے کہ وہ کہو جو کرتے نہیں ہو"۔

اس بات کا تجزیہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ ایک قوم مدعی ہے کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں' اس کے رسول کو مانتے ہیں' اس کی کتاب کو مانتے ہیں اور اس کی شریعت کو مانتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ ماننے کے بعد عمل نہیں کرتے یا عمل کرتے ہیں تو جزوی طور[۲۰] پر۔ اپنے اس طرز عمل کی وجہ سے وہ مسلمان امت جو زمین پر اللہ کی نمائندگی کے منصب پر فائز تھی اس نے الٹی نمائندگی شروع کر دی ہے۔ یہ امت اب خالق اور مخلوق کے درمیان حجاب بن گئی ہے۔ دنیا ان کو دیکھتی ہے اور انہی کے حوالے سے دین کو سمجھتی ہے۔ اس وقت یہ امت مخلوق خدا کو دین کی طرف لانے کے بجائے اس سے لوگوں کو متنفر کر رہی ہے۔

اپنے اس طرز عمل اور غلط نمائندگی کے باعث یہ کافروں سے بڑھ کر مجرم اور زیادہ شدید سزا کی مستحق بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پٹائی ایک مغضوب اور ملعون قوم[۲۱] کے ہاتھوں ہو رہی ہے اور مزید ہو گی۔

یہود کے خواب اور ان کی تعبیر

یہود کے عزائم کو میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ ہمارے ایک ساتھی نے' جو پی آئی اے میں کام کرتے ہیں' ایک چونکا دینے والی بات بتائی۔ پچھلے دنوں وہ اپنی فلائٹ پر بنکاک گئے ہوئے تھے۔ وہاں ٹیلی ویژن پر ایک فلم "Stories of the Bible"

دکھائی جا رہی تھی۔ اس فلم میں تاریخی دلائل و شواہد اور اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے ذریعہ یہودی یہ پرچار کر رہے ہیں کہ ان کا "تابوت سکینہ"[۲۲] مسجد اقصیٰ کے نیچے ایک سرنگ میں موجود ہے۔ جب بخت نصر نے ہیکل سلیمانی منہدم کیا تھا، یہود کے دعوٰی کے مطابق وہ اسی وقت سے یہاں دفن ہے۔ اسی لئے یہود اسے دوبارہ نکالنے کی کوشش بھی کر چکے ہیں۔ اس میں تو وہ ناکام رہے مگر اب بڑی تیزی سے اس طرف جا رہے ہیں کہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر اور "تابوت سکینہ" کی تلاش میں مسجد اقصیٰ کو منہدم کیا جائے۔ اسرائیل کی سپریم کورٹ فیصلہ دے چکی ہے کہ "یروشلم" اسرائیل کا "اٹوٹ انگ" ہے۔

حالات اب روز روشن کی طرح واضح ہو رہے ہیں۔ جو لوگ احادیث صحیحہ سے استفادہ کرتے ہیں ان کی حالت پر مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے۔ اب تو حقائق حدیث مبارکہ کی تشبیہ[۲۳] "مثل فلق الصبح" صبح صادق کی طرح کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔

یہود کی جو سزا موخر تھی اس کی تنفیذ کا وقت بھی قریب آ چکا ہے۔ میں ان حقائق کو حکمت قرآن کی بنیاد پر مانتا ہوں۔ احادیث ان کی تائید کرتی نظر آتی ہیں۔ علاوہ ازیں عقل و منطق بھی اسی بات کی تائید کرتی ہے۔ آپ غور کریں کہ یہود کو کون ختم کر سکتا ہے؟ اسرائیل کے پاس کتنے ایٹم بم موجود ہیں؟ مسلمان ممالک میں سے کسی کے پاس ایک بھی نہیں۔ دنیا کو کچھ پاکستان پر شک ہونے لگا ہے کہ اس کے پاس "اسلامک بم" ہے۔ امریکی سینیٹرز بھی آ کر کہہ گئے کہ ہمیں "اسلامک بم" سے بہت خوف آتا ہے۔ لہٰذا اسرائیل اور یہود کو تو وہی آخری درجے کے معجزے ختم کر سکتے ہیں جو حضرت مسیحؑ کو دیئے گئے ہیں۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی نگاہ جہاں تک جائے گی یہودی پگھلتے چلے جائیں گے۔ یہ الفاظ بھی حدیث میں ہیں کہ اگر کوئی یہودی کسی پتھر کے پیچھے چھپے گا تو وہ پتھر بھی پکارے گا کہ "اے روح اللہ یہ میرے پیچھے ایک یہودی چھپا ہوا ہے" تو گویا ایک دفعہ "گریٹر اسرائیل" قائم ضرور ہو گا مگر پھر وہی ان کا "Greater Graveyard" بھی بنے گا۔

یہ بات بھی عقل و منطق کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ یہود کا "دور انتشار" [illegible]

سے شروع ہوا ہے' جس کے بعد یہود پوری دنیا میں دربدر ہو گئے تھے' جہاں جس کے سینگ سمائے چلا گیا' لیکن مختلف ممالک میں پہنچ کر انہوں نے اپنے اڈے بنا لئے اور جم کر بیٹھ گئے۔ اب یہود کو ختم کرنے کے لئے یا تو پوری دنیا پر عذاب لایا جائے یا ان سب کو کہیں سمیٹ کر ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ یہی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اسرائیل کے قیام کے بعد سے انہیں بظاہر مسلسل فتوحات ہو رہی ہے۔ ان کے ہاتھوں عرب مسلمان پٹ رہے ہیں۔ لیکن در حقیقت مشیت ایزدی اس طرح تمام کوڑے کرکٹ کو جھاڑ دے کر ایک جگہ جمع کر رہی ہے تا کہ سب کو ایک ساتھ دیا سلائی دکھائی جا سکے۔ یہ بات سورۂ بنی اسرائیل میں موجود ہے۔ پہلے رکوع میں تاریخ بنی اسرائیل کے چار ادوار کا ذکر ہے جبکہ آخری رکوع میں فرمایا:

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ۝﴾

"جب آخرت والے وعدے کا وقت آئے گا تو ہم تم سب (یہود) کو لپیٹ کر لے آئیں گے"۔

دیکھ لیجئے! پوری دنیا سے یہودی اسرائیل کا رخ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سب کے سب موجودہ اسرائیل میں تو نہیں سما سکتے۔ لہٰذا "گریٹر اسرائیل" وجود میں لایا جائے گا۔

ان تمام حقائق کے بارے میں اب کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن عہد حاضر میں احادیث نبویہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو استغناء برت رہا ہے' وہ فتنہ انکار سنت اور فتنہ قادیانیت کا نتیجہ ہے۔ اسے ہم "اعتزال جدید" بھی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ روزنامہ "نوائے وقت" میں جب میرے مضامین شائع ہو رہے تھے تو ان کے حوالے سے ایک لمبا چوڑا خط میرے پاس امریکہ سے آیا۔ خط میں کہا گیا تھا کہ آپ پیشین گوئیوں کی باتیں کر رہے ہیں!! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مسلمان ان کے انتظار میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہیں؟۔ ان صاحب سے جب خط و کتابت کا سلسلہ چلا تو معلوم ہوا کہ وہ قادیانی ہیں۔ میں نے انہیں جواباً لکھا کہ پیشین گوئیاں صرف احادیث میں نہیں قرآن میں بھی تو ہیں۔ سورۂ روم کی ابتدائی آیات پیشین گوئی پر مبنی نہیں؟ اس پیشین گوئی میں کہا گیا کہ اگرچہ اس وقت رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں لیکن چند سال کے اندر اندر وہ

دوبارہ غالب آ جائیں گے اور اس دن مومن بھی اللہ کی دی ہوئی فتح پر خوش ہوں گے۔ یہ پیشین گوئی نو سال میں پوری ہو گئی۔ ایک طرف ہرقل نے یروشلم دوبارہ فتح کر لیا اور ایرانیوں کو شکست فاش دی۔ دوسری طرف بدر میں مسلمانوں کو اللہ نے فتح عظیم اور یوم فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والا دن) عطا فرمایا۔ یہ پیشین گوئی نو سال بعد حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ کیا نو سال تک مسلمان ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ گئے تھے اور پیشین گوئی پوری ہونے کا انتظار کرتے رہے تھے؟ نہیں، اس کے برعکس ہوا یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے ماریں کھائیں، ہجرت کی، اہل و عیال کو انسان نما بھیڑیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر مدینے کا رخ کیا اور پھر تین سو تیرہ...... پندرہ سال کی محنت شاقہ کا حاصل...... آپ نے میدان میں لا کر ڈال دیئے، تب فتح مبین حاصل ہوئی۔

اب بھی جو کچھ ہو گا محنت و کوشش سے ہو گا۔ جن کو توفیق ملے گی وہ اس کام میں لگ جائیں گے۔ چنانچہ قرآن کی پیشین گوئیوں کی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پیشین گوئیاں فرمائی ہیں، مگر نہ قرآنی پیشین گوئیوں کا مطلب ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانا تھا اور نہ احادیث میں وارد پیشین گوئیوں کا یہ مطلب ہے۔

☆ ☆ ☆

حواشی

(۱) اس موقع پر یہ بات کہہ لینی چاہئے حضرت طالوت سے لے کر حضرت سلیمان تک کا دور جو تقریباً ایک سو برس پر محیط ہے۔ سابقہ امت مسلمہ کی خلافت راشدہ کا دور ہے۔

(۲) اس سابقہ امت کا وجود تو کسی مصلحت کے تحت (جس کی وضاحت آگے کر دی گئی ہے) اب تک برقرار رکھا گیا ہے تاہم وہ اپنے منصب سے معزول ہو چکی ہے۔

(۳) ہمارے ہاں کچھ لوگ "خلفائے ثلاثہ" کی خلافت کے حق میں ان کے اعمال صالحہ کے بھی منکر ہیں مگر سورۂ نور کی یہ آیت ان کے ان سارے دعووں کی کامل نفی کرتی ہے۔ چنانچہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" میں جن آیات پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے ان میں سے پہلی آیت یہی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے استدلال کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جب

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنے پختہ وعدے موجود ہیں تو ان وعدوں کا مصداق آخر تاریخ میں بھی تو ہوگا۔ اور اگر "خلافت راشدہ" کے دور کو خلافت کا دور اور آیت کا مصداق مان لیا جائے تو قرآن مجید کی شہادت کے مطابق پہلے تین خلفاء بھی ایمان و عمل صالح کا حق ادا کرنے والے ٹھہرتے ہیں گویا حضرت ابو بکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ ایمان اور عمل صالح کے مصداق کامل ٹھہرتے ہیں۔ جبھی تو "خلافت" کے حقدار ہوئے۔ "

یہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہوا ہے۔ ورنہ یہ لوگ اس آیت کو قرآن حکیم سے اب تک اس طرح کھرچ چکے ہوتے کہ اس کا وجود کا سراغ تک نہ ملتا۔

{۴} چاہے۔ خواہ

{۵} مولانا ظفر علی خان مرحوم نے اس آیت کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

{۶} اسی مضمون کی آیت سورۂ توبہ میں بھی معمولی فرق کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔

﴿ یریدون ان یطفئوا نور اللہ بافواھھم ویابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکفرون ﴾ ترجمہ: چاہتے ہیں کہ بجھا دیں روشنی اللہ کی اپنے منہ سے اور اللہ نہ رہے گا بدون پورا کئے اپنی روشنی کو اور پڑے برا مانیں کافر۔ اس آیت میں بھی تذکرہ یہودی کا ہے۔

{۷} یہ اہم نکتہ ہے کہ قرآن مجید صلح حدیبیہ کو فتح مبین قرار دیتا ہے لیکن فتح مکہ کا ذکر اس اہتمام سے نہیں کرتا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ صلح حدیبیہ میں کفار نے مسلمانوں کے وجود کو ایک طاقت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تھا۔ اور یہ سب سے بڑی کامیابی تھی۔ ہمارے زمانے میں عربوں کے مقابلے میں یہود نے ۱۹۴۸ء میں زبردست کامیابی حاصل کی پھر ۶۷ء میں یہود نے عربوں کے بڑے بڑے علاقوں پر قبضہ کر لیا اور ان کی طاقتور ترین حکومتوں مصر اور شام کو شکست سے دوچار کیا۔ لیکن اسرائیل کی اصل اور سب سے بڑی فتح یہ ہے کہ آج تمام عرب ممالک اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ توہین و تذلیل کی حد ہے کہ سب کو اسرائیل کے سامنے ایک میز پر گفتگو کے لئے بلا لیا گیا ہے۔ حالانکہ عرب اس پر کبھی تیار نہ تھے صرف مصر نے یہ ذلت گوارا کی تھی۔ لیکن اب سب کو میڈرڈ میں بلا کر بٹھایا گیا ہے۔ یہ میڈرڈ "تہذیب حجازی" کے مزار اندلس (اسپین) کا معروف شہر ہے۔ اس سے قبل میڈرڈ میں کوئی بین الاقوامی کانفرنس منعقد نہیں ہوئی لیکن عربوں کی تذلیل کے لئے یہ جگہ منتخب کی گئی ہے' جہاں پر آٹھ سو سال انہوں نے حکومت کی تھی مگر جہاں سے ان کا بچہ بچہ ختم کیا گیا اور جہاں سے ان کو ذلیل کر کے نکالا گیا تھا۔

{۸} ۱۹۹۳ء تک

{۹} یعنی میں تمہارے درمیان ہمیشہ نہیں موجود رہوں گا ﴿ انک میت وانہم میتون ﴾ (المومن : ۳۰) (موت تم کو بھی آنی ہے اور موت ان کو بھی آنی ہے) کے تحت اللہ کے حکم سے نبی ﷺ دنیا سے رخت سفر باندھ لیں گے۔

{۱۰} واضح رہے کہ یورپ دو صلیبی جنگیں پہلے لڑ چکا ہے۔

{۱۱} اس موقع پر ایک نہایت عبرت انگیز اور سبق آموز واقعہ اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ہے۔ دوران اسیری انگریز کمانڈنٹ آپ کی درویشی سے متاثر ہو گیا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ آپ لوگ ہماری خلافت کے پیچھے کیوں پڑے ہو؟ یہ تو ایک مردہ خلافت ہے، اس سے آپ کو کیا تکلیف ہے؟ اس نے جواب دیا "مولانا آپ اتنے سادہ نہ بنئے! آپ بھی جانتے ہیں اور ہم کو بھی معلوم ہے کہ یہ گلی سڑی خلافت بھی اتنی طاقتور ہے کہ اگر کہیں دارالخلافہ سے جہاد کا اعلان ہو جائے تو مشرق سے مغرب تک لاکھوں مسلمان سر سے کفن باندھ کر میدان میں نکل آئیں گے۔!!

{۱۲} منطق میں دو معلوم یا تسلیم شدہ باتوں یا قضیوں کو ترتیب دے کر کسی نامعلوم بات جسے نتیجہ کہتے ہیں، تک پہنچنے کو قیاس کہتے ہیں۔ معلوم قضیوں کا subject موضوع کہلاتا ہے۔ جس قضیہ کا موضوع زیادہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے وہ قضیہ "کبریٰ" کہلاتا ہے اور جس کا موضوع نسبتاً کم افراد پر مشتمل ہوتا ہے اس قضیہ یا مقدمے کو "صغریٰ" کہتے ہیں۔ دو قضیوں میں جو مشترک بات ہوتی ہے اسے "حد اوسط" کہتے ہیں۔ صغریٰ اور کبریٰ میں سے حد اوسط نکال دینے سے نتیجہ سامنے آ جاتا ہے۔ مثلاً کرکٹ کھیل ہے (صغریٰ) کھیل تفریح ہے (کبریٰ) نتیجہ: کرکٹ تفریح ہے۔ حد اوسط: "کھیل" کو دونوں جملوں سے خارج کر کے نتیجہ معلوم کر لیا گیا۔

{۱۳} ان تین نسبتوں میں سے "خلیل اللہ" کی نسبت بہت اہم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرمایا تھا: "ولو کنت متخذا خلیلا لاتخذت ابابکر خلیلا" "اگر میں کسی کو اپنا خلیل بناتا (یعنی انسانوں میں سے) تو ابو بکر کو خلیل بناتا۔

اس حدیث سے دو عظیم حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ انبیاء کے علاوہ انسانوں میں سے عظیم ترین انسان ابو بکرؓ ہیں۔ دوسری یہ کہ وہ بھی اس مقام پر نہیں کہ جس کو خلیل کہا جا سکے "خلیل" وہ لفظ ہے جو اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ فرمایا: واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا (النساء : ۱۱۵) یعنی "اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو خلیل بنایا"۔

{۱۴} جہاں جہاں تم کو رنگ و بو کی ایسی دنیا نظر آتی ہے جس کی خاک سے آرزو کا پودا پھوٹتا ہے، اس دنیا کی رونق یا تو مصطفیٰ ﷺ کے نور سے ہے۔ یا وہ دنیا ہنوز مصطفیٰ (ﷺ) کی تلاش میں ہے۔

{۱۵} اس "انجمن اقوام" کے بارے میں اقبال نے تبصرہ کیا تھا:

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیران کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے

{۱۶} (i) صیہونی اکابر تینتیسویں مرتبہ پر فائز یہودی دانشوران کے کل خفیہ اجلاس ۱۸۹۷ء سے منعقد ہونا شروع ہوئے۔

(ii) صیہونی اکابر کے خفیہ اجلاس میں ساری دنیا پر یہودی کی حکومت قائم کرنے کے لئے جو خفیہ دستاویز تیار کی گئی تھیں وہ "پروٹوکول" کے مختصر نام سے معروف ہے اس کا پورا نام The Protocol of the Learned Zions ہے۔ اس دستاویز میں ۲۴ دفعات ہیں۔ اس خفیہ دستاویز کو پہلے دو روسی اخباروں نے شائع کیا پھر عیسائی پادریوں نے ۱۹۰۵ء میں اس یہودی سازش کو بے نقاب کرنے کے لئے شائع کیا۔ اس کا نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہود اس دستاویز کو عام نہیں ہونے دینا چاہتے اور جہاں بھی اس کے نسخے ملتے ہیں انہیں ضائع کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ تاکہ غیر یہود ان کی سازشوں سے بے خبر رہیں۔

{۱۷} جنگ عظیم اول میں برطانوی وزیر خارجہ جس نے جنگ میں یہودی امداد کے معاوضہ میں فلسطین میں جنگ کے بعد یہودی حکومت (اسرائیل) کے قیام کا اعلان کیا تھا۔

{۱۸} قرآن حکیم کی ایک آیت سے بھی اشارہ نکلتا ہے کہ دونوں --- حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام --- کے درمیان کوئی دوسرا نبی نہیں تھا۔ آل فرعون میں سے ایک مومن کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں : ﴿حتى اذا هلك قلتم لن يبعث الله من بعده رسولا﴾ (غافر : ۳۴) "یہاں تک کہ جب وہ (حضرت یوسفؑ) وفات پا گئے تو تم یہ کہنے لگے اب ان کے بعد اللہ کوئی اور رسول نہیں اٹھائے گا"۔

{۱۹} واضح رہے کہ یہ خطاب ۱۹۹۳ء کا ہے اور "تازہ الیکشن" سے مراد ۱۹۹۳ء کے انتخابات ہیں۔

{۲۰} ہماری جہالت اور بدبختی لائق ماتم ہے کہ ہم نے اپنی بے عملی، بدعملی یا دو رنگی کے جواز کے لئے خوب خوب عذر تراش رکھے ہیں۔ چنانچہ ہم بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ اگر ہم بد ہیں تو کیا ہوا، ہیں تو امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں۔ ہم اللہ، رسول کو مانتے ہیں--- نہ ماننے والوں سے تو اچھے ہیں۔ ہم بڑی عقیدت کے مظاہرے کے ساتھ کہتے ہیں "ہم تیرے محبوب کے امتی ہیں" اور پھر اگر ہم کچھ احکام پر عمل کر لیتے ہیں تو ان کے مقابلے میں تو بہتر ہی ہیں جو

کسی حکم کو نہیں مانتے۔ آخر کیونکہ تو ہمارا کریڈٹ ہونا چاہئے۔

یہ ہے ہماری سوچ کا انداز ' مگر قرآن حکیم ہمیں دوسرا ہی فیصلہ سناتا ہے۔ یہودی روش یہ تھی کہ مختلف یہودی قبائل اپنے اپنے حلیف غیر یہودی قبائل کے ساتھ مل کر دیگر یہودی قبائل سے جنگ کرتے اور ان کو گھروں سے نکال کر قیدی بناتے۔ مگر جب وہ گرفتار ہو کر آتے تو ان کو یاد آ جاتا کہ یہ تو ہمارے یہودی بھائی ہیں ' ان کو ہم گرفتار کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ یہودیوں کا فدیہ ادا کر کے ان کو رہائی دلاتے اور فدیہ ادا کرنے کے لئے چندے جمع کرتے۔ یہود کی اس روش پر تنقید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض ﴾ (البقرہ : ۸۵) "تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے کے منکر ہو؟" پھر اس روش کی سزا کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا: "تم میں سے جو شخص یہ طریقہ اختیار کرتا ہے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں وہ رسوا ہو اور آخرت میں اس کو سخت عذاب میں ڈالا جائے"۔ یہ اللہ کا ابدی قانون ہے ' اس میں کسی کے ساتھ رو رعایت نہیں کی جاتی ہے۔

{۲۱} امیر جماعت اسلامی کراچی چوہدری غلام محمد مرحوم اس معاملے کو "چمار کے ہاتھوں پٹوانا" کہا کرتے تھے۔

{۲۲} یہود کے تابوت سکینہ کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ یہ تابوت جو یہود کے دشمنوں کے پاس چلا گیا تھا اس کی واپسی کو "طالوت" کی سرداری کی علامت کے طور پر یہاں بیان کیا گیا ہے۔ اس "تابوت سکینہ" میں کہا جاتا ہے کہ وہ الواح موجود ہیں جن پر تورات لکھی ہوئی حضرت موسیٰؑ کو عطا کی گئی تھی۔ اس کے اندر حضرت موسیٰؑ کے عصا کی موجودگی کا دعویٰ بھی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہود اس "تابوت سکینہ" کو بہت مقدس جانتے ہیں اور اس کو اپنی فتح کی علامت تصور کرتے ہیں۔

{۲۳} حضور ﷺ پر آغاز وحی رویائے صادقہ سے ہوا۔ آپ جو خواب دیکھتے وہ چند دنوں بعد یا اگلے ہی دن وہ واقعہ کی صورت میں ظہور پذیر ہو جاتا۔ اسی بات کو ایک حدیث میں "مثل فلق الصبح" (صبح صادق کی پو پھٹنے کی مانند) قرار دیا گیا ہے۔

◆

2

خطبہ ثانی

عہد حاضر میں

نظام خلافت کا سیاسی ڈھانچہ

ذیلی عنوانات

○ بنیاد پرستی اور اجتہاد

○ خلافت کی حقیقت

○ اجتماعیت کی پہلی سطح ۔ عائلی نظام

○ قرآن میں سیاسی اور معاشی ڈھانچہ موجود نہیں ا

○ خلافت راشدہ کے بعد

○ انسانی حقوق کا احیاء اور ریاستی تنظیم کا ارتقاء

○ دنیا میں رائج دستوری خاکے اور صدارتی نظام کے اسباب برتری

○ نظام خلافت کے لئے تین لوازم

○ اللہ کی حاکمیت

○ کتاب و سنت کے خلاف قانون سازی کی ممانعت

○ مخلوط قومیت کی نفی

○ نظام خلافت میں غیر مسلموں کے حقوق اور پابندیاں

خطبہ مسنونہ، تلاوت آیات اور تمہیدی کلمات کے بعد فرمایا:

ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ آج بیسیوں ادارے معرض وجود میں آ چکے ہیں جو خلافت ہی کا نام لے رہے ہیں، ورنہ اب سے چند سال قبل تو خلافت کا نام تک لینے والا کوئی نہیں تھا۔ گویا مشیت ایزدی کا ظہور "زبان خلق" کی صورت میں ہو رہا ہے۔ لیکن خلافت کی عمومی مقبولیت کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ خلافت کی حقیقت کو سمجھا جائے اور عام کیا جائے، اس کی فلسفیانہ بنیادوں کو ذہنوں میں راسخ کیا جائے اور اس دور میں خلافت کے جو خدوخال ہیں ان کے شعور کو عام کیا جائے۔

بنیاد پرستی اور اجتہاد

خلافت راشدہ کو ختم ہوئے تو تیرہ سو برس بیت چکے ہیں۔ گویا وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ گیا ہے، بہت سے حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ انہی بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر ہمارے دین میں "اجتہاد" کا باقاعدہ ادارہ رکھا گیا ہے تاکہ

"We can move with the movement of time"

تاہم اجتہاد کا مطلب Fundamentale سے روگردانی نہیں، ہمیں کسی معذرت کے بغیر ڈٹ کر کہنا چاہئے کہ ہم Fundamentalist ہیں، مگر اس اصطلاح کا ترجمہ "بنیاد پرست" غلط ہے۔ پرستش تو ہم اللہ کے سوا کسی کی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ہم اپنی بنیادوں کی پرستش تو نہیں کرتے لیکن ہم ان کو برقرار بھی رکھیں گے اور ان کا پرچار بھی کریں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ زمانہ بھی رکتا نہیں ہے بلکہ وہ ارتقاء پذیر ہے۔

جو تھا نہیں ہے' جو ہے نہ ہوگا
یہی ہے ایک حرف محرمانہ

اور واقعہ یہی ہے کہ

"ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں"

لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ اس بدلتے ہوئے زمانے کے چیلنج کا سامنا کرتے ہوئے خلافت کی شکل کیا ہوگی؟

میں اس Fundamentalism کی مثال قرآن سے لیا کرتا ہوں۔ قرآن حکیم میں کلمہ طیبہ کی مثال بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

﴿الم تر کیف ضرب اللّٰہ مثلا کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلها ثابت وفرعها فی السماء﴾ (ابراہیم: ۲۴)

"کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کی مثال بیان کی' جیسے ایک پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط ہے اور جس کی شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں"۔

ظاہر ہے درخت اگرچہ صرف جڑ کا نام نہیں ہے۔ درخت میں تنا بھی ہے' شاخیں بھی۔ آخر برگ و بار شاخوں میں ہی لگیں گے نہ کہ جڑ کے ساتھ۔ اس کے باوجود جڑ کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ درخت کی جڑ کاٹ دیں تو وہ درخت ہی نہ رہے گا' وہ تو سوکھی لکڑی بن جائے گا۔ اس لئے ہمیں پہلے خلافت کے اصولوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ ان اصولوں کے بارے میں ہمیں کوئی compromise نہیں کرنا' بلکہ ان کو جوں کا توں برقرار رکھنا ہے۔ البتہ جہاں حالات متقاضی ہوں وہاں ان اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔

خلافت کی حقیقت

۱۔ اللہ کی حاکمیت: یہ سوال کہ خلافت کیا ہے؟ اس کا مختصر ترین جواب یہ ہوگا کہ خلافت' حاکمیت کی ضد ہے۔ اسلام کے نزدیک حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص

ہے۔ (۱) چنانچہ اسلامی نقطہ نظر سے جو کوئی بھی اپنی حاکمیت کا مدعی ہو گا وہ گویا خدائی کا دعوے دار ہے۔ فرعون کا دعویٰ بھی تو یہی تھا:

﴿الیس لی ملک مصر وھذہ الانھار تجری من تحتی﴾

(الزخرف : ۵۱)

"کیا مصر پر میری فرماں روائی نہیں؟ اور نہریں میرے زیر فرمان رواں نہیں؟"

نظام آبپاشی سارا میرے قبضے میں ہے، جس کو چاہوں پانی دوں اور جس کو چاہوں محروم کر دوں۔ مصر کی ساری معیشت کا دارومدار اسی "Irrigation system" پر تھا۔ اسی لئے اس نے ﴿انا ربکم الاعلی﴾ کا نعرہ لگا دیا۔ نہ فرعون اتنا احمق تھا نہ اس کے ماننے والے اتنے جاہل تھے کہ وہ کائنات کا خالق ہونے کا دعویٰ کر بیٹھتا اور اس کی رعیت یہ دعویٰ کان دبا کر تسلیم کر لیتی۔ دراصل اس کا دعویٰ حاکمیت ہی کا دعویٰ تھا اور اسی دعویٰ کو خدائی کا دعویٰ قرار دیا گیا ہے۔

توحید کی اس اہم فرع کو اچھی طرح واضح کرنے کے لئے میں نے قرآن حکیم کے چار مقامات سے آیات منتخب کی ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

﴿ولم یکن لہ شریک فی الملک﴾ (بنی اسرائیل : ۱۱۱)

"حاکمیت میں اس کا شریک کوئی نہیں ہے"۔

سورۂ کہف میں فرمایا:

﴿ولا یشرک فی حکمہ احدا﴾ (الکہف : ۲۶)

"وہ اپنی حاکمیت میں کسی کو شریک نہیں کرتا"۔

سورۂ یوسف میں ہے:

﴿ان الحکم الا للہ، امر الا تعبدوا الا ایاہ، ذلک الدین القیم ...﴾ (یوسف : ۴۰)

"نہیں ہے حکومت اور حاکمیت مگر صرف اللہ کی، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو"۔

پھر سورۂ نور (آیت ۵۵) میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کا جو منطقی نتیجہ نکلتا ہے یعنی

انسانوں کی خلافت' اس کا ذکر اس طرح فرمایا گیا ہے :

﴿ وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض ﴾

"اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائیں اور عمل صالح کریں کہ وہ ان کو زمین پر ضرور خلیفہ بنائے گا"۔

مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے لئے حاکمیت نہیں' خلافت ہے۔ انسانوں کی حاکمیت' خواہ شخصی ہو یا اجتماعی' قرآن کی رو سے شرک ہے۔ جمہوریت کا اصول Popular Sovereignty ہے۔ یہ بھی اتنا ہی بڑا کفر و شرک ہے جتنا کسی انسان کی انفرادی حاکمیت۔ فرعونیت' نمرودیت' اور عوامی حاکمیت میں نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ بقول اقبال ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

انسانی "حاکمیت" کا عقیدہ ایک نجاست ہے۔ اب خواہ نجاست کا ٹنوں وزنی یہ ٹوکرا کسی ایک شخص کے سر پر رکھ دیا جائے یا تولہ تولہ ماشہ ماشہ کرکے اس نجاست کو جمہور پر تقسیم کر دیا جائے۔ شرک کا یہ نجس عقیدہ تقسیم کر دینے کے بعد بھی نجس کا نجس ہی رہے گا۔ توحید کا تقاضا تو یہ ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔ اور جب حاکمیت اللہ کی ہے تو اب انسانوں کے لئے کیا رہ گیا؟ خلافت اور صرف خلافت [۲] چنانچہ خلافت اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا منطقی نتیجہ ہے۔

اس تصور کو سمجھنے کے لئے انگریزی دور حکمرانی کے وائسرائے کی مثال کو سامنے رکھئے۔ اس دور میں حاکمیت ملکہ برطانیہ یا شاہ برطانیہ کی تھی۔ دہلی میں ان کا وائسرائے ہوتا تھا۔ وائسرائے کا کام صرف یہ تھا کہ اصل حاکم کا جو حکم آ جائے اس کی تکمیل و تعمیل اور تنفیذ کرے۔ اسے کسی چوں و چرا کی جرات نہ تھی کیونکہ حاکمیت اس کی نہیں تھی۔ ہاں جن معاملات میں وہاں سے حکم نہ ملتا وہاں وہ حکمت اور حالات کے تقاضوں کو سمجھ کر اپنی صوابدید سے فیصلہ کر سکتا تھا۔ یہ vicegerency کا صحیح تصور ہے۔ بس فرق یہ تھا

کہ اس کا حاکم ملکہ برطانیہ یا شاہ برطانیہ تھا جبکہ یہاں معاملہ شہنشاہ ارض و سماء کا ہے اور انسان کی حیثیت vicegerent کی ہے۔

۲۔ خلافت جمہور: خلافت کے سلسلہ میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خلافت پوری نوع انسانی کو عطا کی ہے۔ چنانچہ نوع انسانی کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنایا گیا تھا۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿واذ قال ربّک للملٰئکۃ انّی جاعلٌ فی الارض خلیفۃً﴾

(البقرہ: ۳۰)

"اور (یاد کرو) جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمیت کو خلافت دے دی گئی' لیکن ---- (اور یہ لیکن بہت بڑا ہے) ---- نسل آدم میں سے جو خود مختاری کا دعوے دار بن کر بغاوت کی روش اختیار کر لے وہ باغی ہو گیا اور باغی کو زندہ رہنے کا بھی حق نہ ہونا چاہئے۔ تاہم اس کی کم سے کم یہ سزا تو بالکل منطقی ہے کہ اس کا حق خلافت سلب ہو جائے۔ [۳] چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر تو خلافت پوری نوع انسانی کو عطا کی تھی۔ لیکن اب انسانوں میں خلافت کے حقدار صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کر کے اس کے سامنے سر اطاعت خم کر دیں۔ ان کا یہ رویہ "اسلام" ہے اور وہ خود مسلم ہیں۔ اسلام کے معنی ہیں گردن نہادن (گردن جھکا دینا) یعنی to surrender یا to submit۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اب انسانی حاکمیت کے دعوے دار بن گئے ہیں مسلمانوں کو ان کی سرکوبی کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

﴿وقاتلوھم حتّٰی لا تکون فتنۃٌ ویکون الدین کلّہ للّٰہ﴾

(الانفال: ۳۹)

(مطلب یہ ہے کہ یہ باغی ہیں) "ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ و فساد فرو ہو جائے اور دین کل کا کل اللہ کے لئے ہو جائے"۔

جہاد و قتال کے جواز کی توجیہ یہی ہے۔ حاکمیت اعلیٰ سے بغاوت کی اس سزا کو دور حاضر کا

انسان بھی تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ اب قرآن کی اس توجیہ کو وہ بھی قبول کرنے پر مجبور ہے اور اسی توجیہ کی بنیاد پر ہے کہ کوئی بھی دور حاضر کا انسان اپنے حق سے انکار کر سکتا ہے۔

تاہم جب تک مسلمان باغیوں کا قلع قمع کرنے کے قابل نہیں، باغی اپنی اچھل کود دکھا سکتے ہیں، اصولاً تو اس وقت بھی ان کا حق خلافت سلب ہو چکا ہے اور جائز طور پر خلافت اس وقت بھی صرف مسلمانوں کا حق ہے۔

۳۔ خلافت شخصی باقی نہیں رہی: تیسری بات یہ کہ جب تک نبوت کا سلسلہ جاری تھا اس وقت تک خلافت شخصی تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ اس لئے کہ اللہ کا حکم ہر انسان کے پاس براہ راست نہیں آ رہا تھا۔ حاکم حقیقی تو آسمان پر تھا، ہر انسان سے اس کا براہ راست رابطہ نہ تھا، البتہ وحی یا Verbal Communication کے ذریعے صرف نبی کا رابطہ اصل حاکم سے قائم ہوتا تھا۔ احکام اسی کے پاس آتے تھے اور تنفیذ کا ذمہ دار بھی وہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت خلافت شخصی تھی۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام سے صیغہ واحد میں خطاب کر کے فرمایا گیا تھا:

﴿يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ﴾ (ص: ۲۶)

"اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے"۔

اس طرح ارشاد نہیں ہوا کہ "اے بنی اسرائیل ہم نے تم کو خلافت دی ہے" بلکہ خطاب ایک فرد معین سے ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مبارکہ سے بھی اس موضوع پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ فرمایا:

((كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ))

"بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء کے ہاتھ میں تھی، جب بھی ایک نبی کا انتقال ہوتا تھا ایک اور نبی اس کا جانشین ہو جاتا تھا"۔

چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات کے بعد نبوت بھی سلیمان علیہ السلام کو مل گئی اور خلافت بھی۔ پھر چودہ سو برس تک یہ سلسلہ ٹوٹا نہیں۔ مگر دوسرے زمانے میں جب تک نبی اکرم ﷺ موجود تھے آپ ہی خلیفہ تھے۔ جب آنحضرت ﷺ کا انتقال ہو گیا تو آپ

کے ساتھ وحی و نبوت کا سلسلہ تو ختم ہو گیا مگر خلافت کے نظام میں ایک بہت بڑا انقلاب آ گیا۔ چنانچہ اب خلافت مخصوص نہیں اجتماعی ہو گئی۔ چنانچہ سورۂ نور کی آیت ۵۵ پر ایک بار پھر نظر ڈالیے

﴿ وعد الله الذين امنوا منكم وعملوا الصلحت
ليستخلفنهم في الارض..... ﴾

یعنی "اللہ کا وعدہ ہے کہ (اے مسلمانو!) تم میں سے جو لوگ ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کر دیں گے ہم انہیں لازماً زمین میں خلافت عطا کریں گے"۔

دیکھئے یہاں واحد کی ضمیر نہیں ہے بلکہ جمع کی ضمیر ہے۔ گویا اب خلافت مخصوص اور انفرادی کے بجائے اجتماعی بن چکی ہے۔

اب اس دور میں Social Evolution (عمرانی ارتقاء) جس مقام پر پہنچ چکا ہے اس کے حوالے سے "حاکمیت" کا جائزہ بھی لینا ہو گا۔ معاشرتی ارتقاء کے تین stages ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب انسان صرف قبائلی اجتماعیت سے واقف تھا' قبیلے کا ایک سردار ہوا کرتا تھا۔ اب اگر وہ سردار یہ دعویٰ کرتا کہ میرے اختیارات مطلق ہیں' میں جو چاہوں حکم دوں تو گویا اس نے "حاکمیت" کا دعویٰ کیا جو کفر و شرک ہے۔ تاہم اگر وہ تسلیم کرے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں' اللہ کا حکم نافذ کروں گا تو اب اس کی حیثیت خلیفہ کی ہو گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہی پوزیشن تھی' وہ کہیں کے بادشاہ نہ تھے' بس ایک گھرانے کے سردار تھے' لیکن اللہ کے نبی تھے' اللہ کا حکم نافذ کرنے والے تھے۔ گویا وہ اپنے خاندان میں اللہ کے خلیفہ تھے۔

عمرانی ارتقاء کے اگلے مرحلے (stage) میں بڑی بڑی مملکتیں قائم ہو گئیں۔ ان سلطنتوں کے زمانے میں دورِ ملوکیت کا آغاز ہوا۔ یہ ملوک بھی دو قسم کے تھے۔ ایک طرف فرعون جیسے ملوک تھے جو اپنے اختیارِ مطلق کے دعویدار تھے۔ دوسری طرف داؤد علیہ السلام جیسے بادشاہ تھے۔ قرآن مجید میں آتا ہے "وجعلکم ملوکا" اور (اے بنی اسرائیل اس نے تم کو ملوک بنایا) گویا عمرانی ارتقاء کے اس مرحلے (stage) میں وہ

بادشاہ تو ہیں لیکن معناً خلیفہ ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا جو حکم آ رہا ہے اس کو وہ خود بھی مان رہے ہیں اور اس کی تنفیذ بھی کر رہے ہیں۔

اور ---- عمرانی ارتقاء کا اب آخری مرحلہ (stage) عوامی حاکمیت کا دور ہے۔ انسانوں میں اپنے حقوق کا شعور پیدا ہوا۔ ان کے ذہنوں میں سوالات ابھرنے لگے کہ ان کے اوپر انہی جیسا ایک انسان کیسے حکومت کر سکتا ہے۔ اس کے بھی دو ہی ہاتھ اور دو ہی پاؤں تو ہیں۔ یہ حکمرانی تو پوری انسانیت کا حق ہے جس پر ایک شخص قابض ہو گیا ہے مگر اس آخری ارتقاء کی منزل میں بھی حق و باطل کا معرکہ جاری ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شروع سے دو ہی چیزوں کے درمیان معرکہ آرائی رہی ہے' ایک طرف حاکمیت ہے دوسری طرف خلافت۔ گویا :

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

البتہ یہ ضرور ہے کہ حاکمیت کی شکلیں مختلف ادوار میں مختلف رہی ہیں۔ حاکمیت اور خلافت کے ظاہری ڈھانچے بظاہر ایک جیسے ہوتے ہیں' ان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ کہنے کو فرعون و نمرود بھی بادشاہ ہیں اور داؤدؑ و سلیمانؑ بھی بادشاہ۔ لیکن نمرود اور فرعون درحقیقت خدائی کے دعویدار ہیں لہٰذا مشرک اور کافر ہیں جبکہ داؤد اور سلیمان ظاہری اعتبار سے تو بادشاہ ہیں لیکن حقیقت میں خلیفہ ہیں۔ بعینہ یہی پوزیشن آج کے عہد میں ہے۔

علامہ اقبال نے یہ بات اپنی زندگی کی آخری نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں بیان کی ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال کے عمرانی فکر (Social Thoughts) کا خلاصہ آ گیا ہے۔ چنانچہ اس نظم میں ابلیس کا ایک مشیر کہتا ہے : "جمہوریت کا دور آ گیا ہے' ہمیں اس سے بڑا اندیشہ ہے۔ گویا ہماری شیطنت کو چیلنج کرنے کے لئے انسان جاگ اٹھا ہے"۔ دوسرا مشیر کہتا ہے کہ "تمہیں خواہ مخواہ کی تشویش ہو گئی ہے۔ ارے ~

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر"

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور کی جمہوریت دراصل سرمایہ داروں کی آمریت (Dictatorship of the Capitalists) ہے۔ امریکہ کے نظام کو جو لوگ جمہوریت سمجھے بیٹھے ہیں ان کی دماغی صحت یقیناً مشکوک ہے بقول اقبال ۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

امریکہ میں الیکشن لڑنے کے لئے Millionare نہیں Billionare ہونا ضروری ہے۔ ہمارے عام آدمی کے ہاتھ میں تو صرف ووٹ کی پرچی ہے جس نے اسے پاگل بنا دیا ہے۔ یہی پرچی ہمارے ہاں بھی عام آدمی کے ہاتھ میں آگئی ہے مگر پس پردہ کھیل وہاں سرمایہ داروں کا ہے یہاں جاگیرداروں کا ہے۔ جمہوریت تو تب ہوگی جب عوام کے اندر معاشی انصاف قائم ہو جائے۔ اس معاشی انصاف کے بعد ان کے ہاتھ میں پرچی دے کر دیکھئے۔ اب وہ خود فیصلے کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے کہ اس پرچی کو وہ کس کے لئے استعمال کریں۔

ایک طرف عمرانی ارتقاء کے نتیجے میں شیطان نے انسانی حاکمیت کے تصور کو اجتماعی حاکمیت (Popular Sovereignty) کی شکل دے دی ہے تاکہ اس کی شیطنت برقرار رہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے بھی انسانی خلافت کو شخصی خلافت سے ہٹا کر اجتماعی خلافت میں بدل دیا ہے۔ یہ معاملہ ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ حاکمیت اور خلافت کی جنگ مسلسل جاری ہے۔ عہد حاضر کی خلافت "عوامی خلافت" ہے۔ حضرت عمرؓ کے بقول خلافت "امر المسلمین" ہے۔ یہ مسلمانوں کا ایک اجتماعی ادارہ ہے۔ قرآن مجید میں اس فلسفہ کو سورۃ شوریٰ میں ان الفاظ کے ذریعے واضح کیا گیا ہے ﴿وامرھم شوریٰ بینھم﴾ اس سے یہی مراد ہے کہ مسلمانوں کا "امر" مسلمانوں کی باہمی مشاورت سے طے پائے گا۔

خلیفۃ المسلمین : اس وقت بھی ہر انسان اپنی جگہ خلیفہ ہے مگر کس معنی میں؟ اس معنی

ہیں کہ میرا یہ جسم میرے پاس اللہ کی امانت ہے۔ میں اس کے استعمال میں اللہ کا خلیفہ ہوں تاکہ اس جسم پر اللہ کا حکم نافذ کروں اور جسم میں جو صلاحیتیں ودیعت ہیں انہیں اس کی مرضی کے مطابق صرف کروں۔ اس جسم کو وہی دوں جو اللہ نے اس کے لئے حلال ٹھہرایا ہے۔ اگر میں یہ روش اختیار کروں تو خلیفہ ہوں۔ اس کے برعکس اگر میں یہ کہوں کہ اپنے جسم سے اپنی مرضی کے مطابق کام لوں گا تو میں گویا خدائی کا دعویدار ہوں' حاکمیت کا مدعی ہوں۔ چنانچہ سورۃ الحدید میں آیا ہے:

﴿آمنوا باللہ ورسولہ وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ﴾ (الحدید: ۷)

"یعنی ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو ان تمام چیزوں کو اللہ کے راستے میں جن میں اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے"۔

بقول حضرت شیخ سعدیؒ

این امانت چند روزہ نزد ماست
در حقیقت مالک ہر شے خداست

(یہ جو کچھ میرے پاس ہے چند روزہ امانت ہے (ورنہ) ہر چیز کا مالک تو درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے۔)

یہ ہاتھ میری ملکیت نہیں ہیں بلکہ اللہ کی عطا کردہ امانت ہیں۔ میرا پورا وجود اور پھر جو کچھ مزید مال و اولاد کی شکل میں دیا گیا ہے سب اللہ کی امانت ہے۔ اس لئے پہلے خلافت اپنے وجود میں' اس کے بعد اپنے اس گھر میں جس کے آپ سربراہ ہیں' خلافت کا حق ادا کریں۔ لیکن اگر آپ نے اپنے گھروں میں اللہ کے حکم کے بجائے کسی اور کا حکم چلانا شروع کر دیا ہے تو اس صورت میں آپ خلیفہ نہیں' باغی ہیں۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ خلافت کی اجتماعی شکل کیا ہوگی۔ اجتماعی نظام کیسے بنانا ہوگا؟ اس کو اس بات پر قیاس کیجئے کہ اجتماعی حاکمیت کا نظام کیسے بنایا گیا ہے۔ پاکستان میں اس وقت گیارہ کروڑ آدمی بستے ہیں تو کیا گیارہ کروڑ حاکم ہو گئے؟! اگر یہ صورت ہے تو گاڑی کیسے چلے گی؟ "تو بھی رانی' میں بھی رانی' کون بھرے گا پانی" عوامی حاکمیت کا مطلب تو یہی ہے۔ لیکن یہ

دیکھئے کہ نظام کیسے بنایا گیا؟ نظام بنانے اور چلانے کے لئے ووٹ کی ایک پرچی دے کر آپ اپنی حاکمیت کو منتقل کر دیتے ہیں۔ میں رائے کا اظہار ایک شخص کے حق میں کر رہا ہوں، آپ کسی دوسرے شخص کے حق میں کر رہے ہیں۔ یہ شخص حاکمیت کا حق ووٹ کے ذریعے ان لوگوں کو تفویض کر دیتا ہے جو منتخب ہو کر اسمبلی میں پہنچ گئے۔ اگر صدارتی نظام ہے تو یہ اختیار صدر کو منتقل ہو جائے گا۔ گویا ملک کے عوام کی اکثریت نے اپنی حاکمیت اسے منتقل کر دی ہے۔ بعینہٖ یہی معاملہ ﴿امرھم شوری بینھم﴾ میں بھی ہو گا۔ میں بھی اللہ کا خلیفہ ہوں، آپ بھی اللہ کے خلیفہ ہیں، اس لئے کہ خلافت اجتماعی ہے۔ اب اجتماعی نظام بنانے کیلئے کسی اصول کو اختیار کرنا پڑے گا۔ لوگ اپنی "خلافت" کسی ایک شخص کو منتقل کریں گے جو "خلیفۃ المسلمین" کہلائے گا۔ تمام مسلمانوں کے پاس جو حق خلافت تھا اس حق کو ان کی عظیم اکثریت نے اس شخص کو منتقل کر دیا، اس معنی میں وہ خلیفۃ المسلمین ہے۔

خلفاءِ راشدین کے لئے امیر المومنین کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی لیکن خلافت ثانیہ تک پہنچتے پہنچتے اصطلاح بدل گئی۔ اب ان خلفاء کے لئے امیر المومنین کی اصطلاح استعمال نہیں ہوتی۔ ان کے لئے خلیفۃ المسلمین کی اصطلاح استعمال ہونے لگی۔ یہ اصطلاح بالکل صحیح ہے۔ ظاہر بات ہے کہ عہد حاضر میں جو خلافت بنے گی وہ "امرھم شوری بینھم" کے اصول کے تحت ہی بنے گی۔ مسلمانوں کے نزدیک جو شخص اہل ہے وہ اسے اپنا ووٹ دیں گے۔ ان کی اس رائے سے خلیفۃ المسلمین منتخب ہو گا۔ اور اس طرح اجتماعی نظام وجود میں آ جائے گا۔

اب ہمیں اجتماعی نظام پر بات کرنی ہے۔ انسانی اجتماعیت کے اندر مختلف سطحیں (Stages) ہیں جن کی ایک ترتیب تاریخی بھی ہے اور اہمیت کے اعتبار سے بھی۔ اس کے علاوہ ایک ترتیب قرآن حکیم اور دین کے حوالے سے بھی ہے۔

اجتماعیت کی پہلی سطح---- عائلی نظام

انسانی اجتماعیت کا پہلا قدم ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان رشتہ ازدواج

ہے۔ ایک مرد اور عورت کے اس رشتے سے ایک خاندان وجود میں آیا‘ اس سے آگے اولاد ہوئی جس سے خاندان کا یہ سلسلہ وسیع ہوا اور معاشرہ وجود میں آیا۔ گویا اجتماعیت کا پہلا قدم عائلی اور معاشرتی نظام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں اجتماعیت کے دوسرے گوشوں کی نسبت عائلی نظام کے بارے میں بڑے تفصیلی احکام دیئے گئے ہیں۔ اس لئے کہ اگر پہلی اینٹ صحیح رکھی جائے تو پوری عمارت اوپر تک صحیح جائے گی۔ اور اگر پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھی گئی تو پھر بقول شاعر ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

قرآن میں سیاسی اور معاشی نظام کا ڈھانچہ موجود نہیں

قرآن حکیم میں سیاسی اور معاشی نظام کا کوئی ڈھانچہ سرے سے موجود نہیں ہے۔ سیاسی نظام کے صرف اصول دیئے گئے ہیں‘ جبکہ معاشی نظام کے کچھ اصول بھی دیئے گئے اور کچھ احکام بھی موجود ہیں۔ گویا قرآن حکیم کی ترتیب کی رو سے اجتماعی زندگی میں اہمیت عائلی اور خاندانی نظام کو حاصل ہے‘ جبکہ عہد حاضر میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہو گیا ہے۔ آج کی دنیا میں اہم ترین شے سیاسی اور دستوری ڈھانچہ ہے۔ اس لئے کہ جو کچھ دستور میں طے ہو جائے گا گاڑی اسی کے مطابق چلے گی۔ مثلاً دستور کے اندر یہ طے کر دیا جائے کہ کوئی بھی قانون سازی کتاب و سنت کے منافی نہیں ہو سکتی تو ملک میں ایوب خان کے رائج کردہ عائلی قوانین بھی چیلنج کئے جا سکتے ہیں۔ گویا اس عہد میں پورے معاشرتی نظام کو کنٹرول کرنے والی چیز دستور ہے [۴]۔ لیکن قرآن حکیم نے دستوری ڈھانچے کے تمام مباحث کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔

دوسری اہم بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ جہاں تک ریاست کے پورے نظام کا تعلق ہے‘ مثلاً یہ کہ اعضاء ریاست (Organs of the state) کون کون سے ہیں‘ ان کے درمیان حقوق و فرائض کی تقسیم کس طرح ہوگی۔ نیز تحدید و توازن (Checks and Balances) کا پورا نظام کیسے وجود میں آتا ہے۔ غرض یہ سارا فن جس کو

"State Craft" کا نام دیا گیا ہے' یہ تفصیلی ڈھانچہ ہمیں خلافت راشدہ میں بھی ابتدائی صورت میں ملے گا۔ ورنہ دنیا میں یہ پورا ڈھانچہ حقیقتاً بعد میں وجود میں آیا ہے۔ بعض حقائق کو جرأت کے ساتھ تسلیم کر لینے ہی سے بات آگے چلے گی۔ جب خلافت راشدہ کا عہد ختم ہوا تو اس وقت یہ امتیاز کہیں موجود نہ تھا کہ یہ انتظامیہ ہے' یہ مقننہ ہے اور یہ عدلیہ ہے۔ خلافت راشدہ میں یہ اصول ضرور تھا کہ اگر خلیفہ غلط راستے پر چلے تو اسے روکا جائے۔ اب کیسے روکا جائے؟ اس کا کوئی معین راستہ نہیں تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خلافت کی بیعت کے بعد فوراً اعلان کر دیا کہ اگر میں سیدھا چلوں تو تم پر میری اطاعت فرض ہے اور اگر ٹیڑھا ہونے لگوں تو مجھے سیدھا کر دینا۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہے۔ آپ نے ایک دفعہ مسلمانوں کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے سوال کیا: میں سیدھا چلوں' صحیح حکم دوں تو تم کیا کرو گے؟ سب نے جواب دیا: "نسمع و نطیع" کہ ہم سنیں گے اور مانیں گے! اس کے بعد آپ نے پھر پوچھا اگر میں کوئی غلط راستہ اختیار کروں تو کیا کرو گے؟ اس پر ایک شخص مجمع میں سے کھڑا ہو گیا اور اس نے تلوار نیام سے باہر نکال کر کہا کہ ہم تمہیں اس سے سیدھا کر دیں گے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میرے ارد گرد کوئی اندھی بہری بھیڑ نہیں ہے بلکہ یہ زندہ اور ہوش مند لوگ ہیں جو عمر کو بھی سیدھا کر سکتے ہیں۔

خلافت راشدہ کے بعد

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ خلافت راشدہ کے بعد دینی اعتبار سے ہم مسلسل زوال ہی کی طرف گئے ہیں۔ بنو امیہ کے ۹۰ برس کے دور حکومت میں رفتہ رفتہ خلافت راشدہ کے امتیازی اوصاف ختم ہونا شروع ہو گئے۔ اس کے بعد بنو عباس کا دور شروع ہوا۔ اس میں تو ملوکیت اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہو گئی۔ دینی اعتبار سے تو ہم ضرور زوال سے دوچار ہوئے لیکن تمدنی و تہذیبی اعتبار سے اور علمی و فنی اعتبار سے

مسلمانوں نے ایک ہزار برس تک دنیا کی امامت کی۔ دونوں باتوں کو پیش نظر رکھئے، اسلام گر رہا ہے مگر مسلمان نہیں گر رہا۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے جس بلندی پر پہنچایا تھا وہاں سے گرتے گرتے بھی دنیاوی اعتبار سے غلبہ مسلمانوں کے پاس موجود رہا۔

عالم اسلام علوم و فنون کی معراج کو پہنچا ہوا تھا، جبکہ یورپ اس وقت سویا ہوا تھا۔ وہ خود بھی اس دور کو Dark Ages کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہاں سائنس اور فلسفہ پڑھنے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ کسی گھر سے سائنس یا فلسفہ کی کوئی کتاب برآمد ہو جاتی تو اسے زندہ جلا دیا جاتا۔

غرض ایک ہزار سال تک مسلمانوں کا دبدبہ قائم رہا۔ اگر ایک سمت میں ان کے اقتدار کا سورج ڈوبا تو دوسری طرف سے طلوع ہو گیا۔ ہسپانیہ سے مسلمانوں کا خاتمہ ہوا تو مشرق کی طرف سے ترک اسلام کے علمبردار بن کر یورپ میں داخل ہو گئے۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے

ہماری غفلت اور مغرب کی بیداری

مسلمانوں کی کم و بیش یہ حالت ایک ہزار سال تک رہی۔ اس کے بعد ہمارے تین سو برس غفلت کی نیند سو جانے کے ہیں۔ یورپ کو ہم نے اپنی ہسپانوی یونیورسٹیوں سے بیدار کرایا اور خود سو گئے۔ یورپ کو علم، جبر، فلسفہ، سائنس اور منطق ہم نے سکھائے ہیں۔ اٹلی، فرانس اور جرمنی سے نوجوان اسی طرح چل کر غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں میں آتے تھے جیسے آج کا ہمارا نوجوان یورپ اور امریکہ جاتا ہے۔ اس کے بعد کا علمی و تمدنی ارتقاء کل کا کل وہاں ہوا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ "Give the devil his due" یعنی شیطان کو بھی اس کا جائز حصہ ملنا چاہئے۔ بمصداق الفاظ قرآنی ﴿لا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا، اعدلوا ھو اقرب للتقوی﴾ چنانچہ یہ بات ہر انسان جانتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ارتقاء مغرب میں ہوا ہے۔ یہ کل کسی مسلمان نے تو ایجاد نہیں کی، اسی طرح یہ لاؤڈ اسپیکر، اسٹیم

انجن' ہوائی جہاز' وائرلیس' یہ ساری ترقی یورپ ہی میں تو ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ ان کے باپ کی جائیداد نہیں ہے بلکہ نوعِ انسانی کی مشترک میراث ہے' ہمارا بھی اس پر اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ان کا ہے۔ حضور ﷺ کے ایک ارشاد کے مطابق ہمارا حق زیادہ ہے: "الحکمة ضالة المومن' هو احق بها حیث وجدها"۔ یعنی حکمت مومن کی گم شدہ متاع ہے' وہ جہاں بھی اسے پائے کہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ انگریزوں کی ایجاد ہے' ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ اگر ہم یہ طے کرلیں گے کہ ہم غیروں کی کوئی چیز بھی استعمال نہیں کریں گے' تو ہم اپنے پاؤں پر کلہاڑا ماریں گے۔ ہماری اس روش سے ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔

انسانی حقوق کا احیاء اور ریاستی تنظیم کا ارتقاء

یورپ اور مغرب کی سائنسی ترقی کے اعتراف کے ساتھ ایک دوسری چیز بھی ہماری توجہ کی مستحق ہے۔ وہ یہ کہ محمد ﷺ نے ہمیں عوامی حقوق کا اعلیٰ وارفع نظام{۵} دیا تھا' مگر اس کو ہم نے تو ضائع کر دیا' ہم سو گئے' مگر یورپ نے پھر خون دیا۔ فرانسیسیوں نے اپنے خون سے ملوکیت کا خاتمہ کیا اور جمہوریت لائے' انسانی حقوق کا تصور دوبارہ اجاگر کیا۔ یہ انسانی حقوق کا یہ تصور ہم نے دیا تھا' لیکن ہم خود ہی اس سے محروم ہو گئے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
زانکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است {۶}

بہرحال اس معاملے میں بھی ہمیں یورپ کا احسان مند ہونا چاہئے کہ انہوں نے ریاست کی پوری مشینری ایجاد کی ہے۔ یہ اصول بھی انہوں نے ہی دیا کہ ریاست کے تین اجزاء (اعضاء) مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ ہیں۔ یہ کام بھی ہم نے نہیں کیا ہے۔ جس طرح ہم ان کی سائنسی ایجادات کی نفی نہیں کرتے بلکہ ان سے استفادہ کرتے ہیں بالکل اسی طرح ہمیں ان چیزوں کی بھی نفی نہیں کرنی چاہئے۔ اگر ہم نے ان کے عمرانی اور سیاسی

اصولوں کو اسلام کے اصولوں کے ساتھ اختیار نہ کیا تو نقصان اٹھایا کریں گے۔ ہماری اس روش کا بھی ان کو کچھ نقصان نہ ہوگا۔

عہد حاضر میں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ریاست کے اصول وہاں سے لینے ہوں گے، البتہ یہ دیکھنا ہوگا کہ جو چیز اسلام کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی اسے چھوڑ دیجئے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا معاملہ اس اعتبار سے بالکل مختلف ہے جو اسلام سے سو فی صد مطابقت رکھتی ہے، جبکہ عمرانی اور سیاسی فلسفہ و فکر قرآن و سنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ البتہ اس بات کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ جو چیز اسلام کے ساتھ سازگاری اختیار کر سکتی ہے وہ گویا ہماری متاع ہے۔ اس معاملے میں ہماری روش ہونی چاہئے "خُذ ما صَفا دَعْ ما کَدِر"[۷] بلکہ بقول شاعر ؎

خوش تر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی [۸]

دنیا میں رائج دستوری خاکے اور صدارتی نظام کے اسباب برتری

جہاں تک تعلق ہے ریاست کے دستوری خاکے کا، تو اس کی ایک تقسیم تو پارلیمانی جمہوریت اور صدارتی جمہوریت کی صورت میں کی گئی ہے۔ دوسری تقسیم وفاقی، وحدانی اور ایک بہت ہی کم رائج نظام کنفیڈرل (یا میثاقی) نظام میں کی گئی ہے۔ ان میں سے جس کو بھی آپ اپنے حالات کے لحاظ سے پسند کریں اس کے اندر تین چیزیں شامل کر کے اس کو خلافت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

ان تین چیزوں کی وضاحت سے پہلے ایک اور اصولی بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ خلافت کا آئیڈیل نمونہ خلافت راشدہ ہے۔ اس خلافت راشدہ سے قریب تر اور عقلی اعتبار سے زیادہ معقول اور مسلّم صدارتی نظام ہے، پارلیمانی نہیں ہے۔ خلافت راشدہ میں اختیارات کا ارتکاز خلیفہ کی ذات میں تھا۔ عہد حاضر میں امریکہ کا صدارتی نظام اس کے بہت قریب پہنچ گیا ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ خلافت راشدہ میں خلیفہ کا انتخاب تاحیات ہوتا تھا جبکہ یہاں معاملہ ۴ یا ۵ سال کے لئے ہوتا ہے۔ امریکہ کے صدر کو

منتخب ہونے کے بعد کانگریس کی ضرورت نہیں رہتی۔ امریکہ کے بارے میں یہ بات ہم مانتے ہیں کہ وہ دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ اس حوالے سے بطور دلیل سمجھ لینا چاہئے کہ صدارتی نظام پارلیمانی نظام کی نسبت عمرانی ارتقاء کی بلند تر سطح پر ہے۔

اس بات کو دلائل سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ صدارتی نظام پارلیمانی نظام سے بہتر ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ پارلیمانی نظام ان ممالک میں ہے جو برطانیہ کے محکوم رہے ہیں۔ ان ممالک کے باشندوں کی جو بھی تھوڑی بہت تربیت ہے وہ انگریزوں کے زیر سایہ اسی نظام کی ہے۔ ظاہر ہے جو نظام وہ خود اپنائے ہوئے تھے اسی کی تربیت بھی دیتی تھی۔ انگریزوں کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اپنے ہاں کی بادشاہت کو بھی اپنی روایت کی بنیاد پر لے کر چلنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں ملکہ یا بادشاہ بھی رہے' تاج بھی رہے' لیکن ان کے ہاتھ میں کچھ نہ ہو' لہٰذا ان کو "ثنویت"[۴] اختیار کرنی پڑی۔ ان کے ہاں دستوری طور پر ریاست کا سربراہ بادشاہ یا ملکہ ہے' جبکہ حکومت کا سربراہ وزیر اعظم ہوتا ہے۔ تمام اختیارات پارلیمنٹ اور اس کے نمائندہ وزیر اعظم کے پاس ہیں۔ اس وقت یہ نظام برطانیہ کے علاوہ ان ممالک میں ہے جو برطانیہ کے زیر نگیں رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ نظام ان ممالک میں ہے جو اس بیماری میں مبتلا ہیں کہ بادشاہ کو ایک یادگار کے طور پر ضرور سجا کر رکھنا ہے۔ میں اسے "Human Zoo" کہا کرتا ہوں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ بادشاہ یا ملکہ کی حیثیت یادگار سے زیادہ نہیں۔

ہمارے ملک میں بھی یہ نظام اس لئے ہے کہ ہم انگریز کے محکوم رہے ہیں۔ بھارت کے ہاں بھی اسی لئے ہے کہ وہ انگریز کا محکوم رہا ہے۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ یہ انتہائی نامعقول نظام ہے۔ میں نے اسے نامعقول اس لئے قرار دیا ہے کہ ایک کو تو آپ نے بنا دیا سربراہ ریاست اور دوسرے کو سربراہ حکومت' لیکن ان دونوں کے اختیارات میں توازن کیسے ہو گا؟ اس نظام میں کوئی توازن حقیقتاً ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک شخص کو آپ بنا کے تو ہیں سربراہ ریاست مگر کر وہ کچھ بھی نہیں سکتا۔ اس سے زیادہ بھی کوئی نامعقول بات ہو سکتی ہے؟ اگر آپ نے کچھ اختیارات سربراہ ریاست کو بھی دے دیئے تو سمجھئے کہ دیو کی جان طوطے کی گردن میں آ گئی۔ صدر صاحب جب چاہیں عوام کے منتخب وزیر اعظم

کی گردن مروڑ دیں۔ آٹھویں ترمیم کے بعد صدر تو ضیاء الحق جیسا ہی ہو گا کہ اس نے جونیجو صاحب کو ایک منٹ میں رخصت کر دیا۔ ورنہ صدر فضل الٰہی کی طرح ایوان صدر کا قیدی ہو گا' جس کی رہائی کے لئے دیواروں پر نعرے لکھے ہوں گے کہ "صدر فضل الٰہی چودھری کو رہا کرو"۔ اگر صدر کے پاس کوئی کام ہی نہ ہو گا تو وہ بیٹھے بیٹھے تھک جائے گا۔ اور کچھ کرنے کو نہ ہو گا تو بیچارہ سازش ہی کرے گا۔

اصولی طور پر یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جدید ریاست کے جو تین گوشے عدلیہ' انتظامیہ اور مقننہ مقرر کئے گئے ہیں' صدارتی نظام میں بالکل علیحدہ ہوتے ہیں۔ انتظامیہ کا سربراہ صدر منتخب ہونے کے بعد مقننہ (کانگریس) کا دست نگر نہیں ہوتا۔ امریکہ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ کانگریس میں اکثریت ڈیموکریٹس کی ہے مگر صدر ری پبلکن پارٹی سے تعلق رکھتا ہے' مگر اس کے باوجود وہ بڑے اطمینان اور یکسوئی سے انتظامی امور سرانجام دیتا رہتا ہے۔ جبکہ قانون سازی کانگریس کا کام ہے جو کسی خارجی دباؤ کے بغیر اپنا کام کرتی رہتی ہے' لہٰذا کہیں کوئی گڑبڑ نہیں ہوتی۔ عدلیہ پوری آزادی کے ساتھ آئین و قانون کی حفاظت کی ذمہ داری نبھاتی ہے۔ اس کے برعکس پارلیمانی نظام میں مقننہ اور انتظامیہ گڈمڈ ہوتے ہیں۔ یہ سب سے بڑی مصیبت ہے کہ کسی وقت بھی چند مینڈک پھدک سکتے ہیں یا چند گھوڑے بک سکتے ہیں۔ اور بے چارے وزیراعظم کا وقت انہی گھوڑوں کی رکھوالی میں صرف ہو جاتا ہے۔

پارلیمانی نظام کی خامیاں آج ہمارے سامنے زیادہ کھل کر آ گئی ہیں۔ پاکستان کے حالیہ انتخاب[*] کے بعد آزاد امیدواروں کی حکومتیں بنی ہیں۔ گویا آزاد امیدوار اکثریتی پارٹیوں کو بلیک میل کر رہے ہیں۔ بعض صوبوں میں تو یہ تماشا بھی دیکھا گیا کہ تمام آزاد امیدوار وزیر بن گئے اور پارٹی ممبران تک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بن کر رہ گئے۔ صدارتی نظام اتنا صاف ستھرا ہے کہ آپ نے صدر کا انتخاب کر لیا۔ بس اب صدر جس کو اہل سمجھے وزیر بنائے۔ صدارتی نظام میں وزراء کا کانگریس سے ہونا ضروری نہیں ہے۔ جب کہ پارلیمانی نظام میں وزراء کے لئے پارلیمنٹ کا رکن ہونا ضروری ہے۔ صدارتی نظام میں ان لوگوں کی صلاحیتوں سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جو سیاست کے کھیل سے

دور ہیں' لیکن کسی خاص شعبے میں ماہر (Expert) ہیں۔ مثلاً آپ کو مالیات کے لئے ایسا آدمی درکار ہے جو جدید معاشیات سے پوری طرح آگاہ ہو۔ اب ضروری نہیں کہ وہ پارلیمنٹ کا ممبر بھی ہو۔ مگر پارلیمانی نظام میں اس کی خدمات سے آپ استفادہ نہیں کر سکتے جب تک وہ پارلیمنٹ کا ممبر نہ بن جائے۔

نظام خلافت کے لئے تین لوازم

ان اصولی باتوں کے بعد اب ہم ان تین چیزوں پر روشنی ڈالیں گے جن کے شامل کرنے سے کسی بھی نظام حکومت کو خلافت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت : سب سے پہلے یہ بات تسلیم کی جائے کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے کیونکہ خلافت کے لئے پہلی شرط لازم ہی یہ ہے کہ بندہ حاکمیت سے اللہ کے حق میں دستبردار ہو جائے اور تسلیم کرے کہ حاکمیت اللہ کے لئے ہے' بندہ محض اس کا خلیفہ ہے۔[۱۱]

الحمدللہ ہمارے ملک میں دستور کی اساس قرار داد مقاصد میں اللہ کی حاکمیت کا یہ اقرار صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور ہمارے پاس جو بھی اختیارات ہیں' وہ ہمارے ذاتی نہیں بلکہ عطا کردہ یا delegated ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مقدس امانت ہیں۔

یہ اختیارات انہی حدود میں رہ کر استعمال ہوں گے جو اصل حاکم نے معین کی ہیں۔ گویا دستوری سطح پر خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔ جبکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں ملک کی آبادی کی اکثریت کا لحاظ کرتے ہوئے زیادہ زیادہ سرکاری مذہب کا اعلان اس قسم کے الفاظ میں کر دیا جاتا ہے :

"Religion of State is Christianity"۔ ہمارے دستور میں سرکاری مذہب کا اعلان بھی ہے کہ وہ اسلام ہے' حالانکہ قرار داد مقاصد کی منظوری کے بعد اس اعلان کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

۲۔ کتاب و سنت کے خلاف قانون سازی کی ممانعت : نظام خلافت کا دوسرا

لازماً دوسری شرط یہ ہے کہ دستوری سطح پر طے کر دیا جائے کہ یہاں کوئی قانون کتاب و سنت کے منافی نہیں بنایا جائے گا۔ اس لئے اللہ کی حاکمیت کا نفاذ ہو گا کیسے؟ مقننہ جو بھی ہو' اس کا نام چاہے پارلیمنٹ ہو' مجلس ملی ہو' مجلس شوریٰ ہو یا کسی اور نام سے موسوم ہو' اس کا دائرہ قانون سازی کیا ہو گا؟ یہ ادارہ یعنی مقننہ جدید ریاستی ڈھانچے کا اہم حصہ ہے۔ وہ آج کل دستور اور بالخصوص بنیادی حقوق کے خلاف تو قانون سازی کرنے کا مجاز نہیں ہوتا' باقی اسے ہر قسم کے قوانین بنانے کا اختیار حاصل ہوتا ہے' لیکن نظام خلافت میں یہ ادارہ اپنے اختیارات قانون سازی کو کتاب و سنت کے تابع رکھنے کا پابند ہوتا ہے۔ چنانچہ دستوری سطح پر یہ طے کر دیا جائے گا:

"Legislature's authority is limited by the injuctions of the Quran and Sunnah."

سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱ میں اس مفہوم کی بہترین الفاظ میں تعبیر کی گئی ہے:

﴿یایھا الذین امنوا لا تقدموا بین یدی اللہ ورسولہ﴾

"اے اہل ایمان! اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو"

اللہ کی حدود قرآن میں موجود ہیں جبکہ رسول کی حدود حدیث میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نمائندگی قرآن مجید کر رہا ہے جبکہ رسول کی قائم مقامی "سنت" کو حاصل ہے۔ چنانچہ آئینی سطح پر کسی استثناء کے بغیر کتاب و سنت کی کامل بالادستی قبول کرنی ہو گی۔ اگر اس میں ایک چیز بھی نکال دی تو پورا معاملہ ختم ہو جائے گا۔ پھر ہم اس وعید کی زد میں ہوں گے جو سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۵ میں بنی اسرائیل کو سنائی گئی ہے:

﴿افتؤمنون ببعض الکتب وتکفرون ببعض' فما جزاء
من یفعل ذلک منکم الا خزی فی الحیوۃ الدنیا' ویوم
القیمۃ یردون الی اشد العذاب' وما اللہ بغافل عما
تعملون O﴾

"تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو تو تم میں سے جو شخص یہ کام کرے اس کا بدلہ اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں اس کو رسوائی ہو اور آخرت میں ان کو سخت عذاب کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔

اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے"۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس وعید کا مخاطب بننے سے محفوظ رکھے۔ آمین!

کتاب و سنت کی بالادستی تسلیم کرنے کی ایک بہترین مثال ایک حدیث شریف میں وارد ہوئی ہے:

﴿مثل المومن کمثل الفرس فی آخیته' یجول ثم یرجع الی آخیته﴾

"مومن کی مثال اس گھوڑے جیسی ہے جو اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے' گھوم پھر کر اپنے کھونٹے کی طرف لوٹ آتا ہے"۔

آزاد گھوڑا تو جہاں چاہے چرتا پھرے لیکن کھونٹے سے بندھا گھوڑا تو بس وہیں تک جا سکتا ہے جہاں تک اس کی رسی اسے جانے کی اجازت دے۔ رسی کی لمبائی کے مطابق بننے والے دائرے کے اندر البتہ اسے مکمل آزادی ہے کہ جدھر چاہے جائے"۔

یہ حدیث مبارکہ اسلامی ریاست اور نظام خلافت کے دستور کی بہترین مثال ہے۔ چنانچہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اہل ایمان آزاد ہیں۔ وہ "امرھم شوریٰ بینھم" کے اصول پر خود فیصلے کر سکتے ہیں۔ لیکن اس دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔

۳۔ مخلوط قومیت کی نفی: یہ نظام خلافت کا تیسرا لازمہ ہے جسے دنیا کے کسی بھی جمہوری نظام میں شامل کر کے اسے نظام خلافت بنایا جا سکتا ہے۔

اسلامی ریاست میں مقننہ

ایک اور مغالطے کا ازالہ بھی ضروری ہے جو ہمارے مذہبی مزاج کے حامل اکثر لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اسلامی ریاست قائم ہو جائے تو چونکہ شریعت ساری کی ساری موجود ہے۔ لہٰذا کسی مقننہ کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ یہ سوچ دراصل کم فہمی کا نتیجہ ہے کیونکہ جدید صنعتی و سائنسی ترقی سے بے شمار نئے مسائل جنم لے چکے ہیں' جن کے لئے قرآن و سنت کی روشنی میں قانون سازی کی ضرورت ہے۔

صرف زکوٰۃ ہی کے بارے میں بے شمار مسائل پیدا ہو چکے ہیں۔ کارخانوں پر زکوٰۃ کیسے لگے گی؟ ٹرکوں اور بسوں کا کیا حکم ہے؟ کروڑوں روپیہ کی مشینری کا کیا حکم ہو گا؟۔ خود حکومت کی آمدنی سے اخراجات کا Allocation یعنی مختلف مدات مثلاً تعلیم' صحت' دفاع' تعمیر و ترقی پر اخراجات کا تعین اور ان کے مابین تناسب' یہ سارے کام مقننہ کو کرنے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اگر ہم فی الواقع دورِ حاضر میں اسلامی قانون کا نفاذ چاہتے ہیں تو اجتہاد کا دروازہ کھولنا ہو گا جو ہم نے از خود کئی سو سال سے بند کر رکھا ہے۔

اس ضمن میں ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ ہمارا دین اللہ کا دیا ہوا دین ہے۔ اور اللہ تعالیٰ حکیم ہے۔ چنانچہ ہمارے دین میں اصول یہ نہیں ہے کہ کوئی قانون سازی نہیں ہو سکتی جس کی چیزیں کتاب و سنت میں موجود نہ ہوں۔ ایسی صورت میں قانون سازی کا دائرہ بہت محدود ہو جاتا' بلڈنگ کنٹرول کے قوانین' ٹریفک کے قوانین' مختلف قسم کے لائسنسوں کے قوانین' ڈرائیونگ کے قوانین' جہاز رانی کے قوانین' سول ایوی ایشن کے قوانین' غرض یہ بے شمار قوانین کیسے بنائے جا سکتے۔ چنانچہ ہمارے دین میں اصول یہ دیا گیا ہے کہ آپ کتاب و سنت کے منافی کوئی قانون نہ بنائیں۔ اس طرح قانون سازی کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ ہمارے فقہاء کا اصول یہ ہے کہ ہر شے حلال ہے الا یہ کہ کسی چیز کی حرمت ثابت ہو جائے اور اگر اصول یہ ہوتا کہ ہر شے حرام ہے الا یہ کہ کسی چیز کا حلال ہونا ثابت ہو جائے تو حلال کا دائرہ بہت سکڑ جاتا جبکہ حرام کا دائرہ بہت پھیل جاتا۔ چونکہ مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور مباحات کے دائرے میں قانون سازی کی جا سکتی ہے اس لئے قانون سازی کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔

پارلیمنٹ اور اجتہاد

اسی بات کو علامہ اقبال نے کہا ہے کہ اب اجتہاد پارلیمنٹ کے ذریعے ہو گا۔ اگرچہ ان کی اس بات کو ان کے فرزند نے بہت اچھال کر فساد ذہنی پیدا کیا ہے مگر میں علامہ اقبال کی اس بات کو صد فیصد درست مانتا ہوں کیونکہ پارلیمنٹ کے ذریعہ جو اجتہاد ہو گا وہ قرآن و

سنت کے اندر رہتے ہوئے ہوگا۔ اجتہاد تو ہوتا ہی وہ ہے جو کتاب و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے ہو۔ اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی کہ پارلیمنٹ جو کچھ بھی پاس کر دے وہی دین بن جائے۔ اس لئے کہ اگر پارلیمنٹ کے اختیارات کو اتنی وسعت دے دی تو حاکمیت پارلیمنٹ کے پاس چلی جائے گی۔ جبکہ اسلامی ریاست میں حاکمیت فقط اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف عوامی حاکمیت کا جو تصور ہے وہ تو کفر اور شرک ہے۔ ہمیں "عوامی حاکمیت" اور "عوامی خلافت" کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔

یہ ہے پارلیمانی اجتہاد کی اصولی اور عملی صورت۔ یہ عہد حاضر کے چند اہم مسائل ہیں۔ ان کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اسلام میں مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ ایک معاملہ میں مثلاً میں کہتا ہوں کہ یوں ہونا چاہئے جبکہ کوئی دوسرا شخص اجتہاد کرتا ہے کہ معاملہ کسی دوسری طرح ہونا چاہئے' اور اس کے نزدیک اسی کی رائے اقرب الی السنہ ہے تو مندرجہ بالا صورت میں کس کا اجتہاد نافذ ہوگا؟ یہ بات پارلیمنٹ طے کرے گی۔ ظاہر ہے کہ مباحات کے بارے میں پارلیمنٹ طے کر سکتی ہے۔ ہاں وہ حرام کو حلال نہیں بنا سکتی۔ معاملہ اگر مباحات کا ہے تو اکثریت سے طے کر لیجئے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اصول تسلیم کر لینا چاہئے کہ ایسے معاملات کو پارلیمنٹ طے کرے گی۔

اسی بات کو ایک اور حوالے سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ دورِ بنو عباس میں امام اعظمؒ پر دباؤ ڈالا گیا کہ قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کر لیں' آپ کے اجتہادات پر پورا نظام چلے گا' مگر امام ابو حنیفہؒ نے انکار کر دیا۔ (۱۲) انکار اس لئے کیا کہ اسلامی قانون ابھی "formutive stage" میں تھا۔ میں بھی اجتہاد کر رہا ہوں' دوسرے مجتہدین بھی ہیں' لہٰذا میں یہ حق اپنے لئے اختیار کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ میرا ہی اجتہاد سب پر نافذ ہو جائے۔ امام ابو حنیفہؒ جانتے تھے کہ قوت نافذہ بادشاہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ میرا انتخاب کر رہا ہے۔ اس لئے میرا اجتہاد نافذ ہو جائے گا۔

اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ آج سے چند سو سال قبل اورنگزیب عالمگیرؒ نے علماء کی ایک کمیٹی بنائی۔ اس کمیٹی نے اپنے دور کے مطابق فتاویٰ مرتب کر دیئے۔ حالانکہ

فتاویٰ اور فقہ کی کتابیں پہلے بھی موجود تھیں لیکن حالات کی تبدیلی کے تحت اجتہاد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ علماء کو مدعو کیا گیا تھا۔ دور ملوکیت میں بادشاہ کو علماء جو چیدہ تھے ان کو لا کر جمع کر دیا گیا۔ یہ منتخب ادارہ نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس وقت قوت نافذہ بادشاہ کے پاس تھی۔ آج قوت نافذہ ایک شخص کے پاس نہیں رہی بلکہ پارلیمنٹ کے پاس چلی گئی ہے۔ چنانچہ آج وہی اجتہاد نافذ ہوگا اور قانون کا درجہ حاصل کرے گا جو پارلیمنٹ منظور کرے گی۔

کتاب وسنت کی بالادستی کی عملی صورت

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا نفاذ ایک مرحلہ دستوری ہے آپ نے اپنے دستور میں لکھ دیا کہ ہر شے پر قرآن وسنت کی بالادستی ہوگی۔ حاکمیت کے اس دستوری اقرار کے بعد اس کے نفاذ کا عملی مرحلہ باقی ہے۔ اس ضمن میں سورۂ نساء کی آیت نمبر ۵۹ سے رہنمائی ملتی ہے۔

﴿یا ایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی
الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول
ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاخر ذلک خیر و احسن
تاویلا۝﴾ (النساء : ۵۹)

”اے ایمان لانے والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ان حکم والوں کی جو تم میں سے ہوں۔ پھر اگر تم میں کسی چیز کے بارے میں تنازع ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف موڑ دو اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ طریقہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے اچھا ہے۔“

اس آیت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت تو مستقل اور غیر مشروط ہے کیونکہ دونوں کے ساتھ اطیعوا امر کا صیغہ الگ الگ وارد ہوا ہے[۱۳]۔

دوسری بات اس آیہ مبارکہ سے یہ معلوم ہوئی کہ اولی الامر سے نزاع پیدا ہو جائے

کی صورت میں فیصلے کے متعلق اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹانا ہوگا۔ گویا

ا) اولی الامر سے نزاع ممکن ہے[14] جبکہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت بے چون و چرا کرنی ہے۔

ب) نزاع کا فیصلہ اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹانا ہوگا۔

مگر سوال یہ ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹانے کی صورت کیا ہوگی نہ اللہ تعالیٰ خود فیصلے کے لئے موجود ہے نہ رسول موجود ہے۔[15]

عہد حاضر کے دساتیر حکومت اور شہری کے درمیان یا مقننہ اور شہری کے درمیان متنازعہ امور میں فیصلے کا کام اسی طرح عدالتوں کے حوالے کر دیا گیا ہے جس طرح شہری اور شہری کے درمیان اختلاف کا فیصلہ عدالتوں ہی کے ذریعے انجام پاتا ہے۔

چنانچہ کسی قانون یا اقدام کے بارے میں اگر یہ اختلاف پیدا ہو جائے کہ وہ کتاب و سنت کے دائرے کے اندر ہے یا نہیں تو اس نزاع کا فیصلہ بھی دیگر جمہوری دستوروں کی طرح نظام خلافت میں بھی عدالتوں کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں اصولی اجازت، ہدایت اور روشنی قرآن حکیم کی ان عمومی آیات اور احادیث مبارکہ سے حاصل کی جائے گی جن آیات و احادیث میں فصل خصومات و نزاعات میں عدل، غیر جانبداری اور کتاب و سنت کی پاسداری کے عمومی احکام موجود ہیں۔[16]

اسی طرح اس آیت میں اولی الامر کی اطاعت کا حکم تو دیا گیا ہے مگر ان کے تقرر کے طریقہ کو واضح نہیں کیا گیا ہے۔ تقرر کے طریقے کی وضاحت نہ ہونے کی حکمت یہ ہے کہ ہم اپنے تمدنی حالات کے لحاظ سے اور معاشرتی ارتقاء کے مطابق بہتر سے بہتر قابل عمل طریقہ خود اختیار کر سکیں۔ البتہ ایک بات تو یہ واضح کر دی گئی ہے کہ اولوالامر تم میں سے ہونے چاہئیں غیروں میں سے نہیں۔ دوسری بات یہ کہ انکے تقرر میں مشاورت کی روح موجود ہونی چاہئے۔

انتخابات کے ذریعے اولی الامر کا تقرر

اولی الامر کے تقرر کے لئے انتخابات کا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے مگر الیکشن کے

نظام کو اسلامی ریاست میں کچھ حدود و قیود کا پابند کرنا ہوگا۔ تاہم روح عصر کا تقاضا کہ انتخابات زیادہ سے زیادہ Broad Base ہونا چاہئیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں (شہریوں) کی رائے کا اس میں عمل دخل ہو۔ اس ضمن میں بھی سید الفقہا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں انہوں نے فرمایا ہے کہ "المسلم کفو لکل مسلم" یعنی "قانونی و دستوری حقوق کے اعتبار سے تمام مسلمان برابر ہیں"۔ اسلامی ریاست میں ایسا نہیں ہوگا کہ ایک مسلمان متقی ہے لہٰذا اس کے قانونی و دستوری حقوق کچھ زیادہ تسلیم کیے جائیں اور ایک فاسق و فاجر مسلمان کے حقوق کچھ کم ہوں۔ شہری حقوق کے لحاظ سے اسلامی ریاست کے تمام شہریوں کے حقوق یکساں اور قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ البتہ ذمہ داریاں سپرد کرنے میں شہریوں کے علم و عمل کے لحاظ سے ان کے مابین امتیاز کیا جاتا ہے اور کیا جانا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست میں ووٹ دینے کا حق تمام مسلمانوں کو حاصل ہوگا۔ یہ بات اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ روح عصر کا تقاضا بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو نظام حکومت میں اپنی شمولیت کا احساس ہو۔

ووٹر کے اوصاف

البتہ ووٹر پر کچھ نہ کچھ قیود تو لگانی پڑتی ہیں اس ضمن میں ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ ووٹر کی عمر کتنی ہونی چاہئے۔ ۲۰ سال ہو یا ۲۱ سال ہو؟ یا اس سے کچھ کم و بیش ہو؟ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ ووٹر کی عمر کم از کم چالیس ہونی چاہئے۔ میں یہ بات بہت دفعہ کہہ چکا ہوں کہ کوئی نہ کوئی حکمت تو ہے کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے ﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً﴾ (یہاں تک کہ جب وہ اپنی قوت کو پہنچا اور اس کی عمر چالیس سال ہو گئی) اگر ووٹر کی عمر چالیس سال نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس صورت میں شہریوں کا ایک بہت بڑا طبقہ نظام چلانے میں اپنی شرکت کے احساس سے محروم ہو جائے گا۔۔۔ تو الیکشن میں حصہ لینے والے کی عمر ۴۰ سال سے کم نہ ہونی چاہئے۔ لیکن یہ تمام امور مباحات کے دائرے میں آتے ہیں اور باہمی مشاورت سے طے کیے جا سکتے ہیں۔ نیز

پارلیمنٹ میں اس سلسلہ میں قانون سازی کی جا سکتی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ باہمی مشورے سے ووٹر کے لئے تعلیم کی بھی کوئی کم سے کم حد مقرر کردی جائے کیونکہ تعلیم کا تو کوئی پیمانہ ہو سکتا ہے مگر تقویٰ کو ووٹر کی اہلیت میں مد نظر نہیں رکھا جا سکتا۔ کیا پتہ کہ کسی نے ظاہری طور پر تو تقویٰ کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو لیکن اندر سے حقیقت کچھ اور ہو۔

الیکشن میں حصہ لینے والوں کی اہلیت

اسلامی ریاست میں جو لوگ الیکشن میں حصہ لینا چاہیں گے ان کے لئے یقیناً باریک چھلنیاں لگائی جائیں گی۔ انہیں کردار کا ثبوت دینا ہوگا۔ خصوصاً مالی معاملات کی صفائی پیش کرنی ہوگی ان میں سے ہر ایک کو بتانا ہوگا کہ اس کے پاس کتنا مال ہے اور اس نے یہ کہاں سے کمایا ہے؟ آخر اسلامی عدالت میں ہر شخص تو گواہ بن کر نہیں جا سکتا۔ اسے پہلے اپنا کردار ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اس کو اسلامی اصطلاح میں "تزکیہ الشہود" کہا جاتا ہے۔ گواہوں کے بارے میں عدلیہ کے ان تمام اصولوں کو ہم ووٹر اور الیکشن لڑنے والے امیدوار کی شرائط میں بھی بروئے کار لا سکتے ہیں۔ اس طرح سے غلط آدمیوں کے آنے کا راستہ تنگ ہو جائے گا۔ میں نے یہ اصولی اشارے کئے ہیں۔ باہمی مشاورت سے تفصیلات بھی مرتب کی جا سکتی ہیں اور ان مشوروں میں تبدیلی بھی لائی جا سکتی ہے۔

احتسابی نظام

دوسری اہم بات یہ ہے کہ منتخب نمائندگان کے لئے مواخذہ کا ایک موثر نظام بنانا ہوگا۔ یہ نظام اس لئے ضروری ہے کہ منتخب ہو کر آنے والے ابوبکرؓ و عمرؓ نہیں ہیں جن کی طرف سے ہمیں کسی بددیانتی اور خیانت کا اندیشہ نہ ہو۔ خلفاء راشدین کا تزکیہ خود محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔ مواخذے کا یہ نظام عہد حاضر میں ترقی یافتہ ممالک میں کافی موثر ہے۔ چنانچہ امریکہ میں صدر نکسن کے خلاف ابھی مواخذہ (Impeachment) کی تحریک شروع ہوئی تھی کہ وہ از خود مستعفی ہو گیا۔ امریکہ میں

آئین نے صدر کو جہاں بہت زیادہ اختیارات دیئے ہیں وہیں Checks and Balances کے تحت نظام نے صدر کو بھی خاصا جکڑ دیا ہے۔

پاکستانی دستور اور اسلامی دفعات

یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ دستور پاکستان نے اسلامی ریاست کے پہلے دستوری تقاضے ---- اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے اقرار ---- کو قرارداد مقاصد کے ذریعے پورا کر دیا ہے۔ لیکن ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ایک مدت تک یہ قرارداد صرف دستور کا دیباچہ بنی رہی دستور کے واجب العمل حصہ میں نہ ہونے کی وجہ سے اس قرارداد کی بنیاد پر حکومت کے خلاف یا کسی قانون کے خلاف کوئی مقدمہ دائر نہ ہو سکتا تھا۔ پاکستان کی دستوری تاریخ میں پہلی مرتبہ ضیاء الحق مرحوم نے اس ضمن میں قدم اٹھایا اور.... دستور کے دیباچے سے نکال کر اس کو دستور کی دفعہ ۲ (الف) کی صورت باقاعدہ دستور کا جزو بنا دیا۔

لیکن ضیاء الحق مرحوم نے قرارداد مقاصد کو دستور کا جزو تو بنا دیا مگر دستور کے اندر اس قرارداد سے متصادم جو دفعات تھیں ان کو رہنے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سندھ ہائی کورٹ نے قرارداد مقاصد کو اولیت دے کر ایک فیصلہ کر ڈالا۔ جبکہ سپریم کورٹ نے اس فیصلے کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ دستور کی تمام دفعات برابر ہیں کسی دفعہ کو دوسری دفعہ پر فوقیت حاصل نہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جب قرارداد مقاصد کو دستور کا جزو بنا دیا گیا تھا تو اس سے متصادم دفعات کو دستور سے کھرچ دیا جاتا ہے۔ کتاب و سنت کی بالادستی سے متعلق موجودہ دستور کی دفعہ ۲۲۷ جس کے الفاظ اس طرح پر ہیں:

> All existing laws shall be brought in conformity with the injunctions of Islam as laid down in the Holy Quran and Sunnah, in this part referred to as the injunctions of Islam, and no Law shall be enacted which is repugnant to such injunctions

انہی الفاظ سے ملتے جلتے الفاظ میں یہ شق ہر پاکستانی دستور میں شامل کی جاتی رہی ہے۔

یقیناً یہ الفاظ قرآن و سنت کی بالادستی کے اعتراف و اظہار کے لئے کافی ہیں۔ لیکن

افسوسناک بات یہ ہے کہ اس دفعہ میں جو کچھ دیا گیا تھا وہ دستور کے اسی باب کی دوسری دفعات کے ذریعہ واپس لے لیا گیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دستور کی اس دفعہ پر عمل صرف اس طریقے پر ہوگا جس کی تفصیل اسی باب میں بتائی گئی ہے اور اس تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ حکومت ایک اسلامی نظریاتی کونسل نامزد کرے گی جو

(۱) موجودہ قوانین میں سے ان قوانین یا قوانین کے ان حصوں کی نشاندہی کرے گی جو کتاب وسنت سے متصادم ہیں۔

(۲) پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلی اگر کسی مجوزہ قانون کے بارے میں دریافت کرے کہ کسی قانون یا اس کا کوئی حصہ کتاب وسنت سے متصادم تو نہیں ہے تو وہ اس کو اپنے مشورے سے مطلع کرے گی۔ واضح رہے کہ کوئی مجوزہ قانون اسلامی نظریاتی کونسل کو صرف اسی وقت بھیجا جائے گا جب اسمبلی کے کل ارکان میں سے کم از کم ۴۰ فیصد ارکان اس کی ضرورت محسوس کریں۔

(۳) جب صدر یا کسی صوبے کا گورنر (گویا مرکزی یا صوبائی حکومت) کسی قانون کو اسلامی نظریاتی کونسل سے مشورے کے لئے کونسل کو ارسال کریں تو وہ اپنا مشورہ ارسال کرے گی۔ لیکن ان تمام صورتوں میں اسلامی نظریاتی کونسل جو مشورہ دے گی اس کی حیثیت صرف سفارش کی ہوگی۔ مرکزی پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلی کو اختیار ہوگا کہ وہ اس مشورے کو مان لیں یا مسترد کردیں۔ اسی طرح حکومت بھی مشورے کی پابند نہ ہوگی۔

گویا کتاب وسنت کے خلاف کوئی قانون بنانے کا اعلان مکمل طور پر منتخب ایوانوں کے فیصلے پر منحصر ہے۔

اس صورتحال میں ضیاء الحق مرحوم نے دستوری سطح پر اسلام کی طرف پیش رفت کے ضمن میں ایک اور کام بھی کیا۔ لیکن انتہائی نیم دلی کے ساتھ کیا۔ اگرچہ یہ پیش رفت صحیح سمت میں تھی لیکن تمام تقاضے پورے نہیں کیے گئے۔ وہ پیش رفت وفاقی شرعی عدالت کا قیام تھا۔ اس عدالت کو اختیار دیا گیا کہ وہ

(۱) از خود یا کسی شہری کی درخواست پر کسی رائج قانون کے بارے میں فیصلہ کرے کہ

آیا وہ کتاب و سنت سے متصادم ہے۔ اور متصادم ہونے کی صورت میں حکومت کو متعین وقت دے جس کے اندر وہ یا تو اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ کے شریعت بنچ میں اپیل کرنے یا اس قانون کو کتاب و سنت کے مطابق بنائے۔ لیکن مقررہ مدت میں اگر حکومت نے ان دونوں کاموں میں سے کوئی بھی کام نہ کیا تو مدت گزرنے کے بعد وہ قانون خود بخود کالعدم ہو جائے گا۔

لیکن اس عدالت کے قیام میں

(١) ایک غلطی تو یہ کی گئی کہ اس کے لئے بالکل علیحدہ عدالت بنائی گئی حالانکہ اس کو ملک کے نظام عدلیہ کے ساتھ ہی رکھنا چاہئے تھا۔

(٢) دوسری غلطی یہ کی گئی کہ اس عدالت کا درجہ دوسری اعلیٰ عدالتوں سے کم رکھا گیا ججوں کا تقرر صرف ٣ سال کے لئے کیا گیا۔ اور ان کو برخواست کرنے کا اختیار بھی رکھا گیا اس طرح یہ عدالت حکومت کے دباؤ سے آزاد ہو کر فیصلے کرنے قابل نہ رہی۔

(٣) تیسری زیادتی یہ کی گئی کہ اس عدالت کے ہاتھوں میں دو ہتھکڑیاں اور پاؤں میں دو بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ پہلی ہتھکڑی یہ کہ دستور پاکستان اس عدالت کے دائرے سے باہر کر دیا گیا۔ دوسری ہتھکڑی یہ کہ عدالتی قوانین و ضوابط یعنی

> "Any Law relating to the procedure of any court or tribunal"

بھی اس کے دائرے سے باہر ہیں۔ ان کے علاوہ دو بیڑیاں یہ تھیں کہ مسلم عائلی قوانین اس عدالت کے دائرے سے باہر ہے اور دس سال تک مالی قوانین بھی اس عدالت کے دائرے سے باہر رکھے گئے چنانچہ ان کے خلاف بھی اس عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا جا سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ یہ ساری پیش رفت عملاً بیکار ثابت ہوئی کیونکہ قرآن مجید میں سب سے زیادہ تفاصیل تو عائلی قوانین ہی کے بارے میں موجود ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ انگریز نے بھی اپنے زمانے میں ان قوانین کو نہیں چھیڑا تھا بھارت کے مسلمانوں نے بھی

اپنے عائلی قوانین کے لئے تحفظ حاصل کر لیا۔ لیکن ہمارے ملک کے ایک چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر (محمد ایوب خان) نے ایک منکرِ حدیث کے بنائے ہوئے قوانین نافذ کر دیئے وہ اس کے گیارہ سالہ دور میں نافذ رہے اور اب تک نافذ ہیں البتہ ---- ایک جھگلوی جو ایک مقررہ وقت تک کے لئے تھی وہ دس سال پورے ہونے پر کھل گئی لہٰذا وفاقی شرعی عدالت نے وہ تاریخی فیصلہ دے دیا کہ بینک کا سود بھی ربا ہے۔ میرے نزدیک یہ قراردادِ مقاصد کے درجے کا اہم فیصلہ ہے مگر آئی جے آئی کی حکومت نے اس کے خلاف سپریم کورٹ کی شریعت بینچ میں اپیل دائر کر دی جو اب تک زیرِ سماعت ہے۔[۱۶]

گو جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

اس صورتحال سے نتیجہ یہ اخذ کر رہا ہوں کہ کہنے کو تو یہ بات آسان ہے کہ دستور میں قرآن و سنت کی بالادستی کی دفعہ شامل کر دی جائے۔ لیکن ہے یہ بہت کڑوی گولی جس کو حلق سے اتار کر ہضم کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

مخلوط قومیت کی نفی

اب ہم اس تیسری چیز کی طرف آتے ہیں جسے دنیا کے کسی بھی جمہوری نظام میں شامل کر کے اسے خلافت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ وہ تیسری چیز ہے مخلوط قومیت کی نفی۔ اصولی طور پر یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت protected Minority کی ہے۔ وہ اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے ساتھ برابر کے شہری نہیں ہیں۔ یہ بھی بہت ہی کڑوی گولی ہے اسے بھی نگلنا اور ہضم کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ عہدِ حاضر میں پوری دنیا کی سیاست کی گاڑی "سیکولرازم" اور "نیشنلزم" کے دو پہیوں پر چلتی ہے۔ گویا مذہب اور سیاست میں کامل علیحدگی وجود میں آ چکی ہے۔ مذہب ایک شہری کا انفرادی معاملہ ہے جبکہ سیاست معیشت اور سماجی و عائلی نظام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک ملک میں رہنے والے تمام افراد برابر کے شہری ہیں۔

مساوی شہریت کا فریب

مگر یہ بات نوٹ کرنے کے لائق ہے صرف نظری طور پر (یا زبانی دعوے کے مطابق)

یہ سب برابر کے شہری ہیں ورنہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں گوروں اور کالوں کے درمیان فرق و تفاوت کی جو خلیج حائل ہے اسے کون نہیں جانتا۔ اسی طرح بھارت میں جو دنیا کا سب سے بڑا سیکولر ملک ہونے کا دعویٰ ہے شودر اور برہمن کے فرق سے پوری دنیا آگاہ ہے۔ بھارت میں یہی معاملہ مسلم اور غیر مسلم کا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نظریاتی طور پر بھارتی دستور یہی کہتا ہے کہ ہر بھارتی برابر کا شہری ہے۔

عہد حاضر کے پرفریب افکار و نظریات میں سے ایک "مساوی شہری" ہونے کا یہ تصور ایسا دلفریب ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی اور تصور نگاہوں میں جچتا ہی نہیں۔ لیکن یہ بات لازمی ہے کہ اگر آپ نظام خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں تو وطنی قومیت کی نفی کرنی ہوگی[۱۸] اس موقع پر یہ بات بھی نوٹ کرنی چاہئے کہ "جداگانہ قومیت" ہی پاکستان کی اصل ہے۔ اسی نظریہ کے بطن سے پاکستان نے جنم لیا ہے۔ پاکستان وطنی قومیت کی نفی کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا۔ مسلم لیگ کا کانگریس کے ساتھ جھگڑا ہی یہ تھا کہ مسلمان جداگانہ قومیت رکھتے ہیں جبکہ کانگریس کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام افراد، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور پارسی سب ایک قوم ہیں جب کہ ہم نے کہا کہ ہم اس بات کو صحیح نہیں مانتے ہماری قومیت ہمارے مذہب کے ساتھ وابستہ ہے۔

اسلامی تعلیمات کی رو سے اسلامی ریاست میں غیر مسلم کی حیثیت ذمی کی ہے۔ بدقسمتی سے مغرب نے ہمارے ساتھ بہت بڑا داؤ کھیلا ہے۔ چنانچہ ہماری ہر وہ چیز جو اسے پسند نہیں تھی اسے گالی بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس کا مزید المناک پہلو یہ ہے کہ اس گالی کو مغرب نے اتنا اچھالا کہ اپنے بھی کہنے لگے کہ ہم کب ایسا کہتے ہیں۔ ہم پر تو یہ خواہ مخواہ کی تہمت ہے۔ حالانکہ "ذمی" کوئی قابل مذمت اصطلاح نہیں یہ تو درحقیقت لفظ "ذمہ" سے بنا ہوا ہے۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اسلامی ریاست یا نظام خلافت غیر مسلموں کی جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے۔

ایک اعتبار سے تو ذمی مسلمان کو بھی کہا گیا ہے۔ چنانچہ مسلمان ہونے کی کم سے کم شرائط بیان کرنے کے بعد نبی ﷺ نے فرمایا ہے "فذلک المسلم الذی له ذمة

للہ وذمۃ رسولہ" (تو یہ ہے وہ مسلمان جس کے لئے اللہ کا ذمہ ہے اور اس کے رسول کا ذمہ ہے)۔ {۱۴}

نظامِ خلافت میں غیر مسلموں کے حقوق اور پابندیاں

آیئے ہم دیکھیں کہ نظامِ خلافت میں غیر مسلموں کو کون کون سے حقوق حاصل ہوتے ہیں اور کہاں کہاں ان پر تحدید ہے۔ پہلے ہم غیر مسلموں پر عائد بندشوں کو بیان کرتے ہیں۔ اس ضمن میں:

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ کوئی غیر مسلم خلیفہ (سربراہِ مملکت) نہیں ہو سکتا۔ یہ بات عہدِ حاضر میں بھی تسلیم کی جاتی ہے چنانچہ دستوری سطح پر طے کر دیا جاتا ہے کہ ریاست کا سربراہ مثلاً مسلمان ہو گا یا عیسائی ہو گا۔ (بلکہ یہاں تک کہ عیسائیوں کے فلاں فرقے سے ہو گا) لیکن یہ پابندی اس ملک کے سرکاری مذہب کی بنا پر لگائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں یہ معاملہ ہے کہ خلافت اگرچہ اللہ نے پوری نوعِ انسانی کو دی تھی لیکن نوعِ انسانی میں جو حاکمیت کے مدعی بن کر کھڑے ہو گئے (یا جنہوں نے غیر اللہ کی حاکمیت تسلیم کر لی) تو ان کا حقِ خلافت چھین لیا گیا لہٰذا خلافت اب صرف مسلمان کی ہے چنانچہ منطقی طور پر غیر مسلم خلیفہ نہیں ہو گا۔

(۲) دوسری پابندی یہ ہو گی کہ عہدِ حاضر کے نظامِ خلافت میں مقننہ کا رکن کوئی غیر مسلم نہیں بن سکے گا اس لئے کہ نظامِ خلافت میں قانون سازی کا دارومدار کتاب و سنت پر ہے اور جو شخص نہ کتاب اللہ کو مانے نہ سنت کو مانے وہ قانون سازی میں کیسے شریک ہو سکتا ہے!!

(۳) تیسری پابندی یہ ہو گی کہ ریاست کے پالیسی بنانے والے اہم اداروں کی رکنیت بھی غیر مسلم کو نہیں دی جائے گی۔ اس کی وجہ بھی صاف ظاہر ہے کہ جب بھی نظامِ خلافت دنیا میں قائم ہو گا تو اس کی top most priority یہ ہو گی کہ اس نظام کو پوری دنیا میں پھیلانا ہے۔ اب آپ خود سوچئے کہ کوئی غیر مسلم اس پالیسی کی تشکیل اور نفاذ میں معاون و مددگار کیسے بن سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غیر مسلم نظریاتی

بنیاد پر قائم اس نظام خلافت کے قائل ہی نہیں ہیں لہٰذا وہ تو اس کے راستے میں روڑے ہی اٹکائیں گے۔

اس اعتبار سے یہ تینوں ادارے غیر مسلم کے لئے out of bounds ہیں۔

اب ہم ان حقوق کو زیر بحث لائیں گے جو غیر مسلموں کو نظام خلافت کے تحت حاصل ہوں گے۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ نظام خلافت میں غیر مسلموں کی جان و مال عزت و آبرو اتنی ہی محفوظ ہو گی جتنی کسی مسلمان کی ہوتی ہے۔ گویا اس معاملے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا جائے گا۔

(۲) دوسرا حق یہ ہو گا کہ ان کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت مساجد سے بڑھ کر کی جائے گی۔ مساجد سے بڑھ کر حفاظت کرنے کی بات پر ممکن ہے کہ آپ چونکیں۔ لیکن میری بات کی ایک دلیل تو قرآن حکیم میں ہے اور دوسری دلیل خلیفہ راشد حضرت عمر فاروقؓ کے عمل سے ہے۔ سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک قانون بیان کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ
وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا﴾

"اگر اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً کچھ لوگوں کے ذریعے کچھ دوسرے [ظالم] لوگوں کو ہٹاتا نہ رہتا تو یہ خانقاہیں گرجے 'عبادت گاہیں اور مسجدیں منہدم کر دی جاتیں جن کے اندر اللہ کے نام کا بہت ذکر کیا جاتا ہے"۔

اس آیت مبارکہ میں دیکھئے 'دوسری عبادت گاہوں کا ذکر پہلے ہے جبکہ مسجد کا ذکر آخر میں ہے۔

دوسری دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ عمل ہے جو بیت المقدس کی فتح کے موقع سامنے آیا۔ آپؓ گرجا میں تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ آپ کو (گرجے کے منتظمین نے) کہا یہیں نماز ادا کر لیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہرگز نہیں اگر میں نے یہاں نماز پڑھ لی تو مسلمان اس جگہ کو مسجد بنا لیں گے کہ عمرؓ نے یہاں نماز پڑھی

ہے۔ آپ نے گرجا سے باہر نکل کر اس مقام پر نماز ادا کی جہاں بعد میں مسجد عمرؓ تعمیر ہوئی۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ نظام خلافت میں غیر مسلموں کو اپنے personal law پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہوگی چنانچہ شادی بیاہ، نکاح و طلاق اور وراثت کا نظام وہ اپنے مذہب کے مطابق طے کریں گے۔

(۵) پانچویں بات یہ ہے کہ ان کو یہ آزادی ہوگی کہ وہ اپنی آنے والی نسل کو اپنا مذہب جس طرح چاہیں پڑھائیں البتہ مسلمانوں میں تبلیغ کی ہرگز اجازت نہیں ہوگی۔ {۳۰}

(۶) چھٹی بات یہ ہے کہ ان کو تجارت کرنے اور صنعت و حرفت میں حصہ لینے کی مکمل آزادی ہوگی نیز غیر مسلموں کو پورا مواقع حاصل ہوں گے کہ وہ اپنی اہلیت کی بنیاد پر سرکاری ملازمتیں حاصل کریں۔

اگرچہ اس ضمن میں پالیسی تشکیل دینے والے ادارے مستثنیٰ ہوں گے۔ ظاہر بات ہے کہ ہر محکمے میں ایک اعلیٰ ترین سطح وہ ہوتی ہے جہاں پر grand policy طے کی جاتی ہے۔ اس بلند تر سطح پر تو پابندی ہوگی اگرچہ اس سے نیچے تمام شعبوں میں ملازمت کے مواقع غیر مسلموں کو بھی مسلمانوں کی طرح حاصل رہیں گے۔

غیر مسلموں کے حوالے سے ایک آخری اہم بات یہ ہے کہ صدارتی نظام میں اس بات کا امکان بھی ہے کہ مقننہ کا رکن نہ بن سکنے کے باوجود غیر مسلم کو کوئی وزارت بھی دے دی جائے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ نظام خلافت کے تحت اسلامی ریاست کا باضابطہ اور مکمل شہری صرف مسلمان ہوگا کیونکہ نظام خلافت غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت کے باوجود ان پر بہرحال کچھ پابندیاں بھی عائد کرتا ہے۔ جدت پسند لوگ اس پر یہ پھبتی بھی چست کریں گے کہ اس طرح تو وہ second rate citizen بن کر رہ جائیں گے مگر ہم نے اس سلسلہ میں اسلام کی اصولی پوزیشن واضح کر دی ہے۔ جس کو محض طعنوں کے خوف سے ترک نہیں کیا جا سکتا۔

جزیہ کیا ہے؟

یہاں جزیہ کے حوالے سے بھی چند باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔ اس لفظ کو بھی گالی بنا دیا گیا ہے۔ جزیہ جزا سے بنا ہے، چنانچہ ہمارے ہاں جتنا بھی taxation کا نظام ہے وہ سب جزیہ ہی تو ہے۔ اسلامی نظام خلافت میں غیر مسلموں سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جا سکتی چنانچہ ان سے جزیہ وصول کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ غیر مسلم بھی اس ملک کا شہری ہے اور ریاست نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے ریاست جو ذمہ داری لے رہی ہے اس کے عوض اس سے ٹیکس وصول کرے گی۔ وہ ٹیکس یہ جزیہ ہے۔ بدقسمتی سے یہ تمام چیزیں ہماری نگاہوں سے اوجھل اس لئے ہو گئی ہیں کہ آج پوری دنیا میں مسلمان خود جزیہ دے رہا ہے اس وقت پوری دنیا میں ٹیکس کا نظام رائج ہے اسے ہم زکوٰۃ نہیں کہہ سکتے اسے جزیہ ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ جب نظام خلافت کے تحت اسلام کا اقتصادی نظام قائم کیا جائے گا تو موجودہ ڈھانچہ مکمل طور پر بدل جائے گا۔ اس وقت تک ہم ریاست کو اس تحفظ کی ضمانت کے عوض جو ہمیں ریاست کی طرف سے حاصل ہے "جزیہ" دے رہے ہیں، جسے ٹیکس کہا جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

حواشی

(۱) اس کی خوبصورت تعبیر علامہ اقبال نے یوں کی ہے ؎

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آزری

(۲) یا پھر بغاوت

(۳) بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بانی نے خلافت کا حق خود ہی چھوڑ دیا۔

(۴) اس سلسلہ میں ہمارے ملک کی دستوری تاریخ میں ایک دلچسپ واقعہ بھی پیش آ چکا ہے۔ مشہور ماہر قانون اے کے بروہی کسی یہ کہہ بیٹھے کہ جو شخص یہ ثابت کر دے کہ قرآن حکیم میں دستوری خاکہ موجود ہے میں اسے ایک ہزار روپیہ انعام دوں گا۔ ان کی بات ایک اعتبار سے صحیح تھی۔ ظاہر ہے کوئی تفصیلی دستوری خاکہ تو قرآن حکیم میں موجود نہیں ہے۔ قرآن

حکیم نے تو صرف اصول دیئے ہیں۔ قرآن نے نہ صدارتی نظام دیا ہے نہ پارلیمانی، نہ وفاقی نظام دیا ہے نہ وحدانی۔ بات تو مودودی صاحب کی اس حوالے سے درست ہی تھی مگر سیاسی دباؤ کی وجہ سے وہ اپنی بات پر قائم نہ رہ سکے۔ ۰۱۱

{۵} اس نظام سے اعلیٰ نظام تو ممکن ہی نہیں ہے۔ اپنوں کے علاوہ غیروں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے...... ۱۹۳۷ء میں گاندھی اپنے وزراء کو ابوبکرؓ و عمرؓ کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کر رہا ہے۔ اسے کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے (الفضل ما شهدت به الاعداء) مگر اس کے بعد ہم نے گل کھلائے اور عیاشیاں شروع کر دیں۔ علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم میں ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے:

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

{۶} تم (آج) جہاں کہیں رنگ و بو کی وہ دنیا دیکھتے ہو جس کی خاک سے "آرزو" نشوونما پاتی ہے، وہ یا تو نور مصطفیٰ ﷺ سے روشن ہے یا اب تک تلاش مصطفیٰ ﷺ میں سرگرم ہے۔

{۷} صاف کو لے لو گدلے کو چھوڑ دو (عربی مثل ہے)

{۸} بہتر یہ ہے کہ (ان علوم کو) مسلمان کر لو۔ (اور) قرآن کی شمشیر سے (ان کے کفر کو) مار دو۔

{۹} ثنویت (دوئی) دو خدا ماننے والوں کا عقیدہ۔

{۱۰} ۱۹۰ء کے انتخابات

{۱۱} ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ ہم جس ملک میں رہ رہے ہیں اس میں دستوری سطح پر اللہ کی حاکمیت کا اعلان کیا گیا ہے۔ پوری دنیا میں یہ صرف ایک ہی ملک ہے جس کو یہ اعزاز حاصل ہے۔ ان لوگوں کے لئے دعا کرنی چاہئے جن کی کوششوں سے "قرارداد مقاصد" پاس ہوئی۔ یہ "قرارداد مقاصد" بڑے مشکل حالات میں منظور ہوئی تھی۔ جماعت اسلامی جب یہ مطالبہ لے کر اٹھی تھی ایوان میں صرف مسلم لیگی ارکان (یا ہندو) تھے اور جب یہ قرارداد پاس ہوئی تو ان مسلم لیگی ارکان میں سے بعض نے کہا تھا: "اس قرارداد کی وجہ سے دنیا کے سامنے ہمارے سر ندامت سے جھک گئے ہیں کہ ہم نے ایسی رجعت پسندانہ قرارداد پاس کی۔ ہم مہذب دنیا سے آنکھیں چار کرنے کے لائق نہ رہے"۔ ع کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!"

{۱۲} امام ابو حنیفہؒ کا یہ انکار ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ اور وہ سید الطائفہ اور امام اعظم کہلانے کے مستحق ہیں۔

{۱۳} یہ قرآنی بلاغت کا اعجاز ہے کہ اللہ اور رسول دونوں کے ساتھ لفظ اطیعوا کی تکرار ہے لیکن اولی الامر کی اطاعت کو علیحدہ لفظ سے واضح کرنے کے بجائے اس کو اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت پر عطف کر کے ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ اولی الامر کی اطاعت پہلی دونوں اطاعتوں کے ماتحت ہے۔

جبکہ اگر یوں کہا جاتا کہ "اطاعت کرو اللہ کی اس کے رسول کی اور اپنے اولی الامر کی" تو یہ گویا آخری دونوں اطاعتیں اللہ کی اطاعت کی ماتحت ہو جاتی یا یوں کہئے کہ بریکٹ کے باہر کی رقم بریکٹ کے اندر کی ساری رقم سے ضرب کھا جاتی ہے۔

{۱۴} جس کی مثال ایک صورت یہ ہے کہ اولی الامر اپنے کسی حکم کو شریعت کے دائرے کے اندر قرار دیں مگر کوئی شہری اس حکم کو شریعت کے دائرے سے خارج قرار دیتا ہو۔

{۱۵} میں نے یہ الفاظ پورے شعور کے ساتھ کہے ہیں۔ در حقیقت اس آیت میں دو خلا ہیں۔ یہ الفاظ [نعوذ باللہ] کسی بے ادبی کے تحت نہیں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ یہ دونوں خلا اللہ تعالی نے اپنی حکمت کی بنا پر چھوڑے ہیں۔ قرآن مجید بہت سی مصلحتوں کی بنا پر بعض خلا چھوڑ دیتا ہے اس نے صحابہؓ کو اسی لئے کہا ہے کہ "اے مسلمانو! ایسی باتوں کے بارے میں مت پوچھو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تم کو تکلیف دیں (تاہم) اگر نزول قرآن کے وقت تم سوال کرو گے تو ان باتوں کو ظاہر کر دیا جائے گا"۔

گویا ہو سکتا ہے کہ اس طرح تم اپنے اوپر کئی پابندیاں خود عائد کرنے کا موجب بن جاؤ جیسے ایک صحابیؓ نے خطاب کے دوران نبی ﷺ سے دریافت کیا۔ حضور کیا حج ہر سال فرض ہے۔ آپؐ خاموش رہے۔ دوسری مرتبہ پوچھنے پر آپؐ نے فرمایا اگر میں کہہ دیتا کہ ہر سال تو ہر سال فرض ہو جاتا۔ اس لئے خواہ مخواہ سوالات مت کرو"۔

اس آیت کے اندر جو دو خلا ہیں ان میں سے پہلا خلا یہ ہے کہ

(۱) یہ اولی الامر آئیں گے کہاں سے؟ رسولؐ کے نامزد ہوں گے؟ مسلمان ان کو اپنی مرضی سے منتخب کریں گے؟ خود مسلط ہو جائیں گے؟ کوئی طاقتور خاندان گروہ یا فوجی تنظیم ان کو نامزد کرے گی؟ ان سب سوالوں کا واضح جواب قرآن میں موجود نہیں ہے اگر تامل دیکھا جائے تو۔

(الف) نبی ﷺ نے کسی کو نامزد نہیں کیا تھا۔ صرف بعض اشارے کئے تھے۔

(ب) حضرت ابو بکرؓ نے (شوریٰ کے مشورے سے) حضرت عمرؓ کو جانشین نامزد کر دیا۔

(ج) حضرت عمرؓ نے امت کے اتفاق عام کو محسوس کر کے چھ آدمیوں کی کمیٹی نامزد کر

دی۔

(د) حضرت علیؓ کو تمام عالم اسلام کے لئے صرف اہل مدینہ نے منتخب کر لیا کیونکہ یہ دارالخلافہ اور سیاسی مرکز تھا۔

(ہ) بعد میں خاندانوں کے اندر سے حکمران آنے لگے۔

تو اب یہ مختلف صورتیں ہو گئیں بلکہ یہ بھی ہوا کہ بابر آیا اور ابراہیم لودھی کو بے دخل کر کے بزور تخت دہلی پر بیٹھ گیا۔ یعنی متغلب حکمران بھی آ گئے۔

ہمارے فقہاء نے متغلب کی اطاعت بھی لازم ٹھہرائی ہے۔ بشرطیکہ وہ کتاب و سنت کے مطابق حکم چلائے اور امن و امان قائم کر دے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس پر فقہاء کے بڑے لتے لئے ہیں۔ لیکن اگر اس عملی صورت کو تسلیم نہ کیا جائے تو کیا بغاوت برپا ہوتی رہے۔ آخر ہماری اعلیٰ عدالت نے بھی تو نظریہ ضرورت کے تحت مارشل لاء حکمرانی تسلیم کی۔ عدالت فوج سے لڑ تو نہ سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم "اولی الامر" کی تقرری کا معاملہ کھلا رکھا ہے البتہ ایک بات واضح کر دی کہ یہ اولی الامر تم میں سے ہونے چاہئیں جن کی تقرری کی آئیڈیل صورت یہی ہے کہ وہ مسلمانوں کے مشورے سے آئیں۔ چنانچہ یہ اصول دے دیا (وامرھم شوریٰ بینھم) یعنی مسلمانوں کا (اجتماعی) معاملہ باہم مشاورت سے ہونا چاہئے۔

(۴) سورۂ نساء کی مندرجہ بالا آیت میں دوسرا خلا یہ ہے کہ جب اولی الامر کسی معاملے کو کتاب و سنت کے مطابق خیال کرے اور کسی عام شہری کے نزدیک وہ معاملہ کتاب و سنت کے مطابق نہ ہو تو فیصلہ کون کرے گا؟ اس کی کئی صورتیں ممکن ہیں۔

(۱) شہری دلائل کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرے اور اولی الامر اس کی رائے کو مان لے۔ مثلاً مہر کی تحدید کے بارے میں ایک عورت کا آیہ "وآتیتم احداھن قنطارا" سے استدلال سن کر حضرت عمرؓ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔

(۲) شہری اولوالامر کے استدلال سے مطمئن ہو جائے جیسا کہ مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کرنے کے فیصلے سے حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ حضرت ابوبکرؓ کے استدلال کو سن کر مطمئن ہو جائے۔

(۳) عام شہری اپنی رائے کے متعلق علماء اور اہل شوریٰ سے رجوع کرے اور ان کی بات قبول کر لے۔

(۴) علماء اور اہل شوریٰ اولی الامر کو ان کی غلطی پر متنبہ کر کے ان کو اپنی رائے چھوڑنے پر مجبور کریں۔

لیکن ان میں سے کوئی طریقہ بھی باضابطہ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ عہد حاضر کے جدید اسٹیٹ کرافٹ میں عدلیہ نے اس خلا کو باضابطہ طور پر پُر کیا ہے۔ چنانچہ اگر آج کل دستور میں لکھ دیا

جاتا ہے کہ کوئی قانون سازی کتاب و سنت کے منافی نہیں ہوگی اور ملک کی پارلیمنٹ ایک قانون بناتی ہے جو پارلیمنٹ کی رائے کے مطابق قرآن و سنت کے دائرے کے اندر رہتا ہے۔ لیکن کوئی عام شہری یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اب شہری کو --- ثابت کرنا ہوگا کہ کتاب و سنت سے تجاوز ہوا ہے۔ مگر یہ شہری کہاں جائے گا؟ وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گا کیونکہ عہد حاضر میں عدلیہ کو دستور کا محافظ بنایا گیا ہے۔ دستور میں جن بنیادی شہری حقوق کو مہیا کیا جاتا ہے ان کی حفاظت بھی عدالت عالیہ کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ ایک شہری 'ڈپٹی کمشنر یا ایس پی کے خلاف رٹ دائر کر سکتا ہے کہ اس نے میرے دستوری حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا' سورۃ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں یہ دو خلاء موجود ہیں لیکن یہ خلا حکمت کے تحت رکھے گئے ہیں۔ اب اس حکمت کو بھی سمجھ لیجئے۔ دراصل نزول قرآن کے وقت' عمرانی ارتقاء کا عمل (process of social evolution) ابھی جاری تھا۔ اس وقت لوگ ریاست اور حکومت کے فرق تک کو نہیں سمجھتے تھے۔ نہ فن حکمرانی (state craft) کے مطابق ریاست کے تین گوشے... مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ... نوع انسانی پر ابھی منکشف ہوئے تھے۔ لہٰذا قرآن حکیم نے ان تمام چیزوں کو accomodate کرنے کے لئے خلا چھوڑ دیا۔ اگر تمام چیزیں پہلے سے طے کر دی جاتیں تو شاید ہم زمانے کا ساتھ نہ دے سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ چین کی پرانی تہذیب کی طرح عورتوں کے پیروں کو چھوٹا رکھنے کے لئے بچپن میں ان کو لوہے کے جوتے پہنانے کا طریقہ ہماری شریعت نے نہ اپنایا کہ عمرانی ارتقاء کو روکنے والے تفصیلی احکام دے کر ہم کو ایک مخصوص عہد کا پابند بنا دیا جاتا بلکہ احکام وہ دیئے جن جن میں لچک اور وسعت ہے اور جو عمرانی ارتقاء کے کسی مرحلے میں رکاوٹ نہیں ثابت ہوتے۔

غرض یہ کہ عدالت اگر کسی قانون یا اقدام کے بارے میں یہ فیصلہ دے دیتی ہے کہ وہ کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہے تو خواہ وہ قانون کسی کو پسند ہو یا ناپسند اسے ماننا پڑے گا کیونکہ دائرہ مباحات میں پارلیمنٹ کو قانون سازی کا حق ہے چنانچہ پارلیمنٹ کے اجتہاد کا یہ مسئلہ انتہائی سادہ ہے مگر ہمارے بعض جدت پسند اور مغرب گزیدہ دانشوروں نے خواہ مخواہ اسے چیستاں بنا کر رکھ دیا ہے۔

(۴۶) مثلاً چند آیات ملاحظہ ہوں:

(ا) فاحکم بینھم بما انزل اللہ المائدہ : ۴۸

"پس تو فیصلہ کر ان کے درمیان اس چیز کے مطابق جو اللہ نے نازل کی"

(ب) وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط المائدہ : ۴۲

"اور اگر تو فیصلہ کرے تو ان کے درمیان فیصلہ کر انصاف کے ساتھ"

(ج) واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل (النساء : ۵۸)

"اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلے کرو تو عدل کے ساتھ فیصلے کرو"۔

(د) انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما ارٰک اللہ (النساء : ۱۰۵)

"ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ نازل کی تاکہ تو لوگوں کے درمیان اس بصیرت کے مطابق فیصلہ کرے جو اللہ نے تجھے دی ہے"۔

(ہ) وان خفتم شقاق بینھما فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا (النساء : ۳۵)

"اور اگر تم کو ان دونوں (میاں بیوی) کے درمیان اختلاف (بڑھ جانے) کا اندیشہ ہو تو مقرر کرو ایک فیصلہ کرنے والا شوہر کے خاندان سے اور ایک بیوی کے خاندان سے"۔

اس سلسلہ میں آیات اور احادیث بکثرت ہیں جن کے مطابق عدالتوں کو کتاب و سنت اور انصاف پر مبنی فیصلے کرنے کی واضح ذمہ داری حوالے کی گئی ہے۔

(۱۷) اور پی پی پی کی حکومت نے سپریم کورٹ کی شریعت بنچ کے دونوں ججوں کو فارغ کر کے شریعت بنچ ہی کا خاتمہ کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

(۱۸) آخر ایک ملک کی قوم دوسرے ملک کی قومیت کے ساتھ اگر مخلوط نہیں ہو سکتی تو اللہ تعالیٰ کو مقتدر اعلیٰ ماننے والے اپنی قومیت جداگانہ کیوں نہ رکھیں اور اللہ کے سوا دوسرے کے لئے اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنے والوں کو اپنی قومیت میں کیوں شامل کریں۔

(۱۹) اس لئے ذمی گالی نہیں بلکہ ایک اعزاز ہے۔

(۲۰) کیونکہ یہ تبلیغ ریاست کے مقتدر اعلیٰ کے خلاف بغاوت کی تبلیغ ہوگی جس کی اجازت کوئی ریاست نہیں دے سکتی۔ لیکن کیا کم ہے کہ مقتدر اعلیٰ کا اقتدار نہ ماننے والوں کو ریاست میں بلا حقوق کے ساتھ رہنے کا حق حاصل ہو۔

◆

3

خطبہ ثالث

عہد حاضر میں
نظام خلافت
کا
معاشی و معاشرتی ڈھانچہ

ذیلی عنوانات

○ مارکسزم کے رہنما اصول اور اسلام
○ نظام سرمایہ داری کے بنیادی اصول اور اسلام
○ سرمایہ داری نظام کو اسلامی نظام میں کیسے بدلا جا سکتا ہے؟
○ اسلامی نظام معیشت
○ اسلامی اصولوں پر عمل کی صورتیں
○ زمین کا مسئلہ
○ قمار یا جوا
○ دور ملوکیت کے مفاسد
○ فقہ پر ملوکیت کے اثرات
○ بیع موجل اور بیع مرابحہ
○ دور ملوکیت کے باقیات سیئات
○ زکوٰۃ کی حقیقت
○ اسلام کا معاشرتی نظام
○ معاشرتی نظام کے اصول ومبادی

اس حد درجہ اہم موضوع پر گفتگو سے پہلے چند تمہیدی باتیں واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس عہد میں آج سے پہلے جب بھی اقتصادیات کے موضوع پر بات ہوتی تھی تو سوشلزم یا کمیونزم کے اقتصادی نظام اور مغربی سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام کے مابین ایک تقابل ہمارے سامنے آتا تھا کیونکہ دنیا میں بالفعل یہی دو نظام موجود تھے۔ جہاں تک تعلق ہے اسلام کا' وہ ذہنوں اور کتابوں میں تو موجود ہے مگر بالفعل کسی خطہ زمین پر اس کا وجود نہیں ہے۔ گویا وہی بات کہ

مسلمانی در کتاب و مسلماناں در گور
(اسلام کا وجود "کتاب" میں ہے اور مسلمان قبر میں)

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اس دنیا کے دو اقتصادی نظاموں میں سے ایک کی تو گویا موت واقع ہو چکی ہے۔ چنانچہ اس کا حریف مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام اس وقت بڑے سرور اور نشے کی کیفیت میں ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ کمیونزم اور سوشلزم کے اقتصادی نظام کی ناکامی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارا نظام صحیح ہے۔ مغرب میں اپنی اس فتح پر جشن منایا جا رہا ہے۔

اصولاً یہ بات عرض کر دوں کہ کمیونزم کا اقتصادی نظام اگرچہ ایک غیر فطری انتہا پسندی کو چھونے لگا تھا لیکن اصلاً وہ مغرب کی سرمایہ دارانہ معیشت کا فطری و منطقی ردعمل تھا۔ اس وقت دنیا میں پھر وہی مغربی سرمایہ دارانہ نظام چھایا ہوا ہے۔ چنانچہ اگر اسلام کا عادلانہ اقتصادی نظام دنیا میں نافذ نہ ہوا تو ردعمل دوبارہ کسی اور شدید تر شکل

میں ظاہر ہو جائے گا۔ مغربی سرمایہ دارانہ نظام میں یقیناً کوئی فساد تھا کہ رد عمل کیونزم کی صورت میں ظاہر ہو گیا۔

مارکسزم کے رہنما اصول اور اسلام

اسلام نے مارکسزم (کیونزم) کے رہنما اصولوں (Cardinal Principles) کو اپنے ہاں روحانی اور اخلاقی سطح پر برقرار رکھا ہے قانونی سطح پر نہیں۔ انسانی ملکیت کی نفی ہے' بلکہ اللہ کی ملکیت ہے' نہ کسی انسان کی انفرادی ملکیت ہے نہ ہی قومی ملکیت ہے۔ قرآن مجید میں یہ کلمات ایک سے زائد مرتبہ وارد ہوئے ہیں: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے)

انسان کے پاس جو کچھ ہے امانت ہے۔ انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ محض انسانی محنت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے' اور فضل اسے کہا جاتا ہے جو کسی استحقاق کے بغیر عطا ہو۔ جبکہ اجرت اور اجر استحقاق کی بنیاد پر ملتے ہیں۔ بندۂ مومن کو یہ کبھی نہ سمجھنا چاہئے کہ اسے جو کچھ ملا ہے یہ سب کچھ اس کی کمائی اور محنت سے میسر آیا ہے' نہ ہی اسے اپنی صلاحیت اور ذہانت کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ سورۂ جمعہ میں ارشاد ہے:

> ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ
> فَضْلِ اللّٰهِ﴾
>
> یعنی "جب نماز (جمعہ) مکمل ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو"

چنانچہ اس فضل میں سے انسان کا جائز حق صرف اس کی ضروریات ہیں۔ اور جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہے وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لئے ہمیں عطا کر دیا ہے۔ امتحان یہ ہے کہ اس زائد مال کو فقراء اور مساکین میں تقسیم کرتے "حق بحق دار رسید" (حق حقدار کو پہنچ گیا) پر عمل کرتے ہو یا اس پر غاصبانہ قبضہ کر کے بیٹھ جاتے ہو کہ

میرا مال ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

﴿ویسئلونک ماذا ینفقون قل العفو﴾

یعنی "اے رسول ؐ یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا انفاق کریں۔ کہہ دیجئے 'ضرورت سے جتنا زائد ہے (العفو) اس کا انفاق کرو (بھلائی کے کاموں میں خرچ کرو)"۔

آپ غور کیجئے اس سے بھی اونچا کوئی سوشلزم ممکن ہے۔ لیکن یہ ہے رضاکارانہ' اختیاری۔ اس کو قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مطابق زندگی گزاری ہے۔ آپ نے پوری زندگی کچھ بچا کر رکھا ہی نہیں کہ زکوٰۃ کا سوال پیدا ہو۔ میں جب یہ کہا کرتا ہوں کہ حضور ﷺ نے پوری زندگی زکوٰۃ دی ہی نہیں تو اس پر لوگ چونک جاتے ہیں۔ زکوٰۃ دینے کا سوال تو تب پیدا ہوتا ہے جب آپ کچھ بچا کر رکھتے اور صاحب نصاب ہوتے۔ اس کو میں spiritual socialism سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔

جس روحانی سوشلزم کا ذکر ابھی ہوا ہے اس پر نبی اکرم ﷺ کے علاوہ بہت سے فقراء صحابہ نے بھی زندگی گزاری ہے۔ ان فقراء صحابہ میں حضرت ابوذر غفاری ؓ شدت زہد کی وجہ سے کسی قدر انتہاپسندی کی طرف مائل ہو گئے۔ چنانچہ ان کا نظریہ یہ تھا کہ سونے کا ایک ٹکڑا بھی اپنے پاس رکھنا حرام مطلق ہے۔ پھر یہ معاملہ صرف صحابہ ؓ تک بھی محدود نہیں بلکہ ہمارے صوفیائے عظام نے بھی اسی روحانی سطح پر زندگی بسر کی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام انہی صاحب کردار لوگوں کی وجہ سے پھیلا۔ جبکہ ہمارے ہاں جو بادشاہ آئے وہ اسلام کی طرف دعوت دینے کے بجائے اسلام سے متنفر کرنے والے تھے۔

نظام سرمایہ داری کے بنیادی اصول اور اسلام

مندرجہ بالا اصولوں کے برعکس میں آپ کو تین ایسے اصول بتانا چاہتا ہوں جن کی بنیاد پر آج مغربیت کھڑی ہے اور یہ اصول اسلام میں بھی موجود ہیں۔

۱ ۔ پہلا اصول : قانونی سطح پر نجی ملکیت (Private ownership) کا ہے۔ اس کے تحت آپ کسی بھی چیز کے قانوناً مالک ہو سکتے ہیں۔ ہر استعمال کی شے کے

مالک ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح ذرائع پیداوار (Means of production) کی بھی نجی ملکیت (Private ownership) ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آپ دوکان، کھیت اور کارخانے کے مالک ہو سکتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت کا اصل الاصول ہی نجی ملکیت کا تصور ہے۔ اسی تصور کا منطقی نتیجہ ذاتی ترغیب (Personal insentive) کی صورت میں نکلتا ہے۔ چنانچہ آپ زیادہ محنت کریں گے، راتوں کو جاگیں گے، اپنی ذاتی جائیداد میں اضافہ کریں گے تو تمام پیداواری اضافہ آپ کا اپنا ہو گا۔ کیمونزم کی موت واقع اسی لئے تو ہوئی ہے کہ وہاں یہ ذاتی ترغیب (personal insentive) کا عنصر مفقود تھا۔ ہر شخص فطری طور پر سوچتا ہے کہ میں زیادہ کام کیوں کروں جبکہ مجھے معلوم ہے ---- کہ مجھے ایک معین مشاہرہ ہی ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں جو صنعتیں قومیائی گئیں ان کا بیڑہ غرق ہو گیا۔ ظاہر بات ہے کہ کارخانہ دار تو راتوں کو جاگے گا۔ اسے معلوم ہے کہ کارخانے کا خراب پرزہ اگر راتوں رات نہ بن گیا تو میرا کارخانہ کل بند رہے گا جس سے مجھے اتنے لاکھ کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس کے برعکس اگر جنرل مینیجر صاحب صرف ایک تنخواہ دار آدمی ہیں تو اس کا اپنا کوئی ذاتی مفاد تو اس میں ہے نہیں، وہ کس لئے محنت کرے۔ کارخانہ خراب ہوتا ہے ہو، کام بند ہوتا ہے تو ہو جائے۔

۲ - دوسرا اصول : دوسری چیز Market Economy ہے، جو رسد و طلب suply and demand کے اصول پر مبنی ہے۔ اس اصول کے تحت چیزوں کی رسد اگر زیادہ ہے اور طلب کم ہے تو قیمتیں گر جائیں گی۔ اس کے برعکس اگر رسد کم ہے اور طلب زیادہ ہے تو قیمتیں بڑھ جائیں گی۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی artificial control کی ضرورت نہیں اور اگر آپ مصنوعی طور پر کنٹرول کریں گے تو لوگوں کو بے ایمان بنانے کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔

۳ - تیسرا اصول : مغربی سرمایہ دارانہ معیشت کا تیسرا اصول Hire and Fire ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کسی شخص کو اپنے ہاں ملازم رکھتے ہیں۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کا کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ اسے

احسن انداز میں انجام دے گا۔ آپ یہ بھی اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کی out-put کیا ہو گی۔ اسی بنیاد پر آپ اس سے تنخواہ کا معاملہ بھی طے کر لیتے ہیں۔ یہ سارا عمل Hire ہے۔ لیکن آپ کچھ عرصے بعد محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس صلاحیت کا مالک نہیں یا وہ محنت نہیں کرتا تو اسے ملازمت سے برخواست کر دیتے ہیں۔ یہ Fire کا عمل ہوا۔ اور آپ جس طرح Hire کرنے کے مجاز تھے اسی طرح اپنے مفاد کے مدنظر Fire کرنے کے مجاز بھی ہیں۔

سرمایہ داری نظام کو اسلامی نظام میں کیسے بدلا جا سکتا ہے

یہ تینوں اصول اسلام میں بھی موجود ہیں، مگر جس طرح نظام خلافت کے سیاسی اور دستوری نظام پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ کسی بھی جمہوری نظام میں تین چیزیں شامل کر دی جائیں تو وہ نظام خلافت میں تبدیل ہو جائے گا۔ یعنی اللہ کی حاکمیت، کتاب و سنت کی کامل بالادستی اور مسلم قومیت کا تصور۔ بالکل اسی طرح مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام سے تین چیزیں نکال دیجئے تو وہ اسلامی نظام معیشت میں ڈھل جائے گا۔

۱ ۔ پہلی چیز جو مغربی سرمایہ دارانہ نظام سے نکالنی ہے وہ ربا ہے۔ یہ ہے تو ایک چیز لیکن بہت ہی بھاری ہے۔ یہ ربا نظام معیشت میں بری طرح پیوست ہو چکا ہے۔[1] آپ یوں سمجھئے کہ کینسر ہے جو پورے جسم میں سرایت کر چکا ہے۔ آپ کہاں کہاں سے آپریشن کریں گے۔ گویا ؎

تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم

(پورا جسم زخموں سے چور چور ہے (مرہم کا) پھاہا کہاں کہاں رکھوں)

بالکل اسی طرح یہ ربا ہماری معیشت کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے، جو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے بغیر نہیں نکل سکتا۔ اور ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے اس عمل ہی کا نام انقلاب ہے۔

۲ ۔ دوسری چیز جو سرمایہ دارانہ نظام معیشت سے نکالنی ہے وہ جوا ہے۔

۳ ۔ تیسری چیز جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کو نکال دیجئے۔

بظاہر یہ تین چیزیں بہت چھوٹی لگتی ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ نظام کو مکمل طور پر بدلے بغیر ان کو نکالنا ممکن نہیں ہے۔

اسلامی نظام معیشت

اسلام کے نظام معیشت کے حوالے سے میں چند بنیادی باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام یہ تو چاہتا ہے کہ سرمایہ کاری ہو مگر وہ سرمایہ داری کو باقی رکھنے کا روادار نہیں۔ مغربی معیشت سرمایہ کاری پر مبنی ہے۔ لیکن جب اس میں سود شامل ہو جاتا ہے تو سرمایہ کاری' سرمایہ داری بن جاتی ہے۔ سرمایہ کاری تو یہ ہے کہ آؤ کام کرو۔ سرمایہ لگاؤ اور تجارت کرو۔ لیکن تم کو سرمایہ داری کی اجازت نہیں ہے۔ سرمایہ داری یہ ہے کہ محض سرمایہ کو نفع اندوزی کا ذریعہ بنایا جائے۔ محنت بھی نہ کی جائے اور نقصان میں شرکت بھی نہ کی جائے۔ اس کا نتیجہ دولت کے ارتکاز کی صورت میں نکلتا ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم نے کہا ہے کہ :

﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ﴾

یعنی "ایسا نہ ہونا چاہئے کہ سرمایہ صرف دولت مندوں ہی کے درمیان گردش کرتا رہے"۔

کیونکہ اس طرح طبقاتی تقسیم پیدا ہو جائے گی اور قرآن مجید کی اصطلاح میں "مترفین" اور "محرومین" کے دو طبقے وجود میں آ جائیں گے۔

مترفین کا طبقہ اس طرح وجود میں آتا ہے کہ ہر معاشی proposition میں تین امور شامل ہوتے ہیں۔

(الف) سرمایہ (ب) محنت (ج) اور موقع۔ کیونکہ وہی سرمایہ کاری اور وہی محنت کسی خاص وقت یا جگہ پر زیادہ نتیجہ خیز اور منافع بخش ثابت ہوتے ہیں۔ جبکہ وہی سرمایہ اور وہی محنت کسی دوسرے وقت اور جگہ پر اس قدر نتیجہ خیز نہیں ثابت ہوتے۔ اسی کو موقع یا chance کہتے ہیں۔

اسلام نے اصلاً زور محنت پر دیا ہے۔ گویا محنت کو تحفظ حاصل ہے جبکہ --- سرمایہ کو

محض سرمایہ کی حیثیت سے Earning Factor بنا دیا جائے تو اسلام کی نظر میں یہ غلط ہے۔ اسی طرح محض chance کی حیثیت سے اگر کمائی کا ذریعہ بنا دیا جائے تو یہ حرام ہے۔ جب سرمایہ سرمائے کی حیثیت میں Earning Agent بنتا ہے تو اس کی بدترین شکل سود ہے۔ ربا یہی ہے کہ محض سرمایہ کے بل پر ایک مقرر و معین منافع حاصل کیا جائے، اس طرح کہ نقصان سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ اسلام اور قرآن کی رو سے اس سے بڑھ کر کوئی شے حرام نہیں ہے۔

اسی طرح "جوا" ہے۔ یہ کیا ہے؟ محض chance کی بنا پر منافع حاصل کرنا۔ اس میں محنت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسلام کی رو سے یہ حرام ہے۔ ان دونوں صورتوں کو اسلام نے اس لئے حرام قرار دیا کہ ساری توجہ محنت پر مرکوز ہو۔ اگرچہ ظاہر بات ہے کہ محض محنت سے کچھ نہیں ہوتا۔ محنت کے ساتھ کچھ نہ کچھ سرمائے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور کچھ نہ کچھ دخل chance کا بھی ہوتا ہے۔ لیکن محض chance کی بنا پر کمائی جوا ہے اور محض سرمایہ کی بنیاد پر بے خطر کمائی ربا ہے۔

اسلامی اصولوں پر عمل کی صورتیں

اب ہم ان اصولی باتوں کا عملی زندگی پر انطباق کرتے ہیں۔ آپ کا اپنا سرمایہ ہے اور اپنی محنت بھی ہے تو یہ بالکل جائز ہے۔ اگر کسی کے پاس سرمایہ تھوڑا ہے تو وہ چھابڑی لے کر بیٹھے گا۔ اگر زیادہ ہو گیا تو ریڑھی بنائے گا اور گنجائش ہوئی تو کھوکھا لگا لے گا۔ اسی طرح درجہ بدرجہ بڑھتا چلا جائے گا۔ اس ضمن میں قرآن حکیم نے صرف ایک قدغن لگائی ہے:

﴿یا ایھا الذین امنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا
ان تکون تجارۃ عن تراض منکم﴾ (النساء : ۲۹)

یعنی لین دین جو ہو باہمی رضامندی سے ہو۔ اگر آپ کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھائیں یا دھوکہ اور فریب سے کسی کا مال ہتھیا لیں تو آپ اخلاقی (اور قانونی) جرم کے مرتکب سمجھے جائیں گے۔

اسی طرح ایک سے زائد لوگ مل کر سرمایہ جمع کریں۔ اور خود مل کر محنت کریں اس کا نام شراکت ہے۔ یہ بھی بالکل جائز ہے' بلکہ پسندیدہ اور مطلوب ہے۔ اس میں بھی ایک شرط عائد کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ limited ذمہ داری کا تصور نہ ہو۔ یہ تصور حرام ہے۔ دنیا میں تمام اسکینڈل اسی limited company کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ آپ نے اپنے سرمایہ کو نکال لیا' اپنے assets بچا لئے اور پھر کمپنی کو دیوالیہ قرار دے دیا۔ اب وہ روتے پھریں جن کو ادائیگیاں کرنا آپ کے ذمہ تھا۔ آپ کی ذاتی جائیداد سے وہ اپنا قرض وصول نہیں کر سکتے۔ شراکت کے نظام میں total liability ہونی چاہئے۔ ہمارے ہاں پوری صنعت کا یہی معاملہ ہے۔ اکثر ایسے ہوتا ہے کہ تھوڑا سا سرمایہ اپنا لگایا اور بینک سے بہت بڑا قرض صنعت کے نام پر لے لیا۔ اس قرض ہی سے اپنا سرمایہ نکال لیا۔ اور بہت کچھ لوٹ کھسوٹ کر shake hand deal کا طریقہ اپنا لیتے ہیں۔ اس طرح سارا تاوان بینک پر آجاتا ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ بینک کس کا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ بینک میں لوگوں کی ہی دولت جمع ہوئی ہے۔ یہ سارے سرمایہ دارانہ ہتھکنڈے ہیں جو دنیا میں ایجاد ہو چکے ہیں۔ اس کے برعکس شراکت کا تصور یہ ہے کہ آپ کے کاروبار میں کوئی شریک ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو آپ کو ذمہ داری قبول کرنی ہوگی۔ گویا آپ کو اس کا تاوان ادا کرنا ہوگا۔

تیسری شکل یہ ہے کہ سرمایہ کسی اور کا ہے اور کام کرنے والا کوئی دوسرا شخص ہے۔ اس شکل کو بھی شریعت نے جائز قرار دیا ہے۔ اس کو مضاربت کہتے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہاں بھی سرمایہ دار محض اپنے سرمایہ سے نفع حاصل کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی عملی صورت یہی ہے کہ سرمایہ میرا ہے اور محنت آپ کر رہے ہیں۔ گویا مجھے نفع بغیر محنت کے محض سرمائے کی بنیاد پر ہو رہا ہے' لیکن یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اصل تحفظ محنت کو حاصل ہے' سرمایے کو نہیں۔ اگر نقصان ہوتا ہے تو مکمل طور پر وہ شخص برداشت کرے گا جس نے سرمایہ لگایا ہے۔ اس تصور سے سرمایہ دارانہ ذہنیت کی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی سرمایہ دار یہ کام کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔

بہرحال مضاربت میں اگر نفع ہوتا ہے تو سرمایہ لگانے والا اور محنت کرنے والا برابر کے شریک ہیں۔

لیکن اس صورت سے آگے بڑھ کر محض سرمایہ کی بنیاد پر متعین نفع بغیر کسی نقصان کے حاصل کرنا شریعت میں اس شدت سے حرام ہے کہ اس سے زیادہ شدت سے کوئی اور چیز حرام نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اس حرام کا ارتکاب کرنے کے سلسلہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ﴾

"تو اس روش پر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سمجھو"

آپ حیران ہوں گے کہ کسی اور گناہ پر اعلان جنگ نہیں کیا گیا!! اگر اعلان جنگ آیا ہے تو وہ سود پر آیا ہے۔ مگر ہم اس سود کو بہت ہلکی چیز سمجھے بیٹھے ہیں۔

سود کی شناعت

نبی ﷺ نے سود کی شناعت کو ایک تمثیل سے واضح کیا ہے۔ سمجھانے کا یہ انداز خود قرآن کریم میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ سورۂ حجرات میں غیبت کی شناعت کو مردہ بھائی کے گوشت کھانے کی تمثیل سے واضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح سود کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "الربوا سبعون حوبا" سود ایسے ستر گناہوں کے برابر ہے جن میں سب سے ہلکا گناہ یہ ہے کہ "ایسرھا ان ینکح الرجل امہ" کہ آدمی خود اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کا مرتکب ہو۔

اب اس حدیث کی روشنی میں سود کے گناہ کی شدت اور تناسب کا حساب لگایا جا سکتا ہے۔ (العیاذ باللہ) ستر گناہوں میں سے سب سے ہلکا گناہ اپنی ماں کے ساتھ بدکاری۔ استغفراللہ۔

سود کا دائرہ

سود کے بارے میں پوری دنیا میں ایک مغالطہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ قرآن جسے ربا کہتا ہے وہ تو صرف "USURY" ہے۔ یعنی کوئی شخص ذاتی استعمال کے لئے قرض لے اور

قرض دینے والا اپنی اصل سے زیادہ وصول کرے اور واپسی کی مدت میں جتنا اضافہ ہو قرض دینے والا اسی نسبت سے اصل قرض پر اضافہ کرتا چلا جائے۔ حالانکہ ربا صرف یہی نہیں بلکہ کمرشل انٹرسٹ اور بینک انٹرسٹ بھی ربا ہے۔

یہ سعادت بھی اسی خطہ ارضی کے حصے میں آئی ہے کہ یہاں کی وفاقی شرعی عدالت نے اپنے مبسوط اور مدلل فیصلہ میں تجارتی قرض کے انٹرسٹ اور بینک انٹرسٹ کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ ہمارے ہاں کے بڑے بڑے "جغادری" دانشوروں نے عدالت میں جا جا کر دلائل دیئے کہ بینک انٹرسٹ ربا نہیں۔ ان دانشوروں میں کراچی کے خالد ایم اسحاق صاحب اور لاہور سے ایس ایم ظفر بھی شامل ہیں۔ ان سب نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا لیکن دلائل میں مار کھائی۔ اللہ تعالیٰ جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کو اجر عطا فرمائے جنہوں نے کمال جرات کے ساتھ مدلل فیصلہ دیا۔ عہد حاضر میں بینک انٹرسٹ کو حرام قرار دینا کوئی معمولی بات تو ہے نہیں۔

زمین کا مسئلہ

اب میں اس سے بھی زیادہ "senstive Issue" کی طرف آ رہا ہوں، اور وہ ہے زمین کا مسئلہ۔ میں نے شروع ہی میں عرض کیا تھا کہ جن تین خرابیوں کو نکال کر کسی بھی نظام معیشت کو اسلامی بنایا جا سکتا ہے، ان میں سے ایک جاگیرداری اور غیر حاضر ملکیت زمین (Absentee Land lordism) کا نظام بھی ہے۔ اس بات کو آپ یوں سمجھئے کہ زمین آپ کی ہے، آپ محنت کریں، خوب محنت کریں اور زیادہ سے زیادہ فوائد پیداوار حاصل کریں "چشم ما روشن دل ما شاد"۔ لیکن اصل مسئلہ پیدا اس وقت ہوتا ہے جب زمین کسی اور کی ہو اور محنت کوئی دوسرا کرے۔ ایک اور صورت یہ ہو سکتی ہے کہ زمین بھی جمع کریں اور محنت بھی، جیسے "شراکت" میں ہوتا ہے۔ اس طرح آپ "Collective Farming" کر سکتے ہیں گویا آپ نے وسائل اور محنت جمع کر دی۔ لیکن یہ سارا معاملہ رضاکارانہ اور فریقین کی آزاد مرضی سے ہونا چاہئے۔ اس میں کسی قسم کے جبر کا دخل نہیں ہونا چاہئے۔

زمین کی زراعت کی ایک تیسری صورت بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ زمین مثلاً میری ہے لیکن کاشت کوئی اور کرے۔

اس ضمن میں جو بات میں کہنا چاہتا ہوں، اس کو سمجھنے کے لئے پہلے ایک اصول کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے کیونکہ جب تک حکم کی منطق سمجھ میں نہیں آئے گی اس وقت تک بات پوری طرح گرفت میں نہیں آئے گی۔ اصل بات یہ ہے کہ زمین کے سلسلہ میں مضاربت کا اصول نہیں چل سکتا کیونکہ مضاربت میں سرمایہ لگانے والے کو منافع میں حصہ دینے کا جواز اس بنیاد پر پیدا ہوا تھا کہ نقصان کی صورت میں نقصان سارا سرمایہ دار کو برداشت کرنا ہوگا لیکن یہاں سرمایہ زمین ہے۔ زمین کا کیا بگڑے گا وہ تو جوں کی توں موجود رہے گی جبکہ سرمایہ کل کا کل یا اس کا کوئی حصہ ڈوب سکتا ہے مگر زمین کی صورت میں تو صرف کارکن کی محنت ڈوبتی ہے۔ لہٰذا مضاربت کا معاملہ زمین میں نہیں ہو سکتا۔ اگر سرمایہ دار (زمین کا مالک) نقصان میں بھی شریک ہو سکتا تو مضاربت کی طرح مزارعت بھی جائز ہوتی۔

مزارعت کے بارے میں ائمہ فقہ کے مسالک

مزارعت امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ دونوں کے نزدیک مطلقاً حرام ہے۔ پھر مزارعت کیسے اور کیونکر جائز ٹھہرائی گئی اس کی وضاحت میں کروں گا۔ فقہ حنفی میں اس کی حلت کا فتویٰ صاحبین (قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ) نے دیا لیکن ہمارے چوٹی کے دو ائمہ اس کے حرام مطلق ہونے کے قائل ہیں۔ ان دونوں ائمہ فقہ کی اہمیت اس حوالے سے بھی ہے کہ ان میں سے امام ابوحنیفہ کو اہل الرائے کا سرخیل تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ امام مالکؒ اصحاب حدیث کے سرخیل ہیں۔ گویا دونوں مکاتب فکر کے top most ائمہ مزارعت کو حرام مطلق سمجھتے ہیں۔ حرام ہونے کی وجہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ مزارعت کو مضاربت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں پورے جزم کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ مزارعت حرام ہے، جائز نہیں ہے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ شرائط عائد کر کے مزارعت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں مزارعت کا نظام ان

شرائط کو بھی پورا نہیں کرتا۔ کچھ عرصہ قبل کراچی کے مشہور عالم اور قاضی عبد اللطیف کے بڑے بھائی جناب مولانا قاضی عبد الکریم صاحب سے میری خط و کتابت اسی موضوع کے بارے میں ہوئی تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ مروجہ مزارعت کو کون حلال کہتا ہے؟ قاضی ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ بھی اسے جائز نہیں کہتے بلکہ جواز کے لئے بڑی کڑی شرطیں عائد کرتے ہیں۔ یہ معاملہ غیر حاضر مالک زمین (Absentee Land lordship) کا ہے۔ تم اپنی زمین خود کاشت کرو۔ اور اگر معاملہ اس کے برعکس کر رہے ہو تو تم نے سودی معاملہ کیا۔

نظام جاگیرداری

اب ہم جاگیرداری کی طرف آتے ہیں۔ ہمارے ہاں جاگیرداری کی جو معصیت ہے اسے شمشیر فاروقی ہی سے ختم کیا جا سکتا ہے وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے۔

خوشتر آن باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی

(بہتر یہ ہے کہ تم اسے مسلمان بنا لو۔ اور قرآن کی تلوار سے اسے مار دو)

جاگیرداری کے خلاف حضرت عمر فاروقؓ کا یہ بہت بڑا اجتہاد تھا جو اجماع کی شکل اختیار کر گیا۔ ان معاشی مسائل کو اچھی طرح سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں کی مذہبی سیاسی جماعتوں نے اسلام کا نعرہ تو لگا دیا لیکن ان مسائل کو چھیڑا ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کے ذہن میں نفاذ اسلام کا بس یہی تصور ہے کہ کوڑے لگیں گے اور ہاتھ کٹیں گے (ظاہر ہے کہ وہ اسلام سے بھاگیں گے نہیں تو اور کیا کریں گے۔ اسلامی نظام کی برکات کو تو سامنے لایا ہی نہیں گیا۔ یہاں تک کہ ہمارے ہاں کی دو مذہبی سیاسی جماعتوں نے اپنے اپنے انتخابی منشور میں "تحدید ملکیت زمین" کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ یعنی ایک مخصوص شرح سے زیادہ کسی شخص کے پاس زمین نہیں رہنے دیں گے۔ فرض کیجئے کہ یہ شرح ۲۵۰ ایکڑ ہے۔ تو اب جس کی ملکیت مثلاً پانچ سو ایکڑ ہے اس کی پونے پانچ سو ایکڑ کس دلیل کی بنیاد پر آپ واپس لیں گے؟ آپ کے ملک میں سپریم کورٹ

کی شریعت بیچ مفصل فیصلہ دے چکی ہے کہ آپ کسی کی ملکیت میں سے کوئی شے جبراً نہیں لے سکتے۔ اگر کسی قومی ضرورت یا تقاضے کے تحت کوئی شے لینا ناگزیر ہو جائے تو مالک کو معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ گویا آپ شرعی دلیل کے بغیر ایک انچ زمین بھی نہیں لے سکتے۔

ہمارے پاس الحمدللہ دلیل موجود ہے۔ ہم نے اس موضوع پر بحث کا آغاز ایک عرصے سے کر دیا ہے اور یہ بحث وسیع حلقے میں پھیل رہی ہے۔ ظاہر ہے قیل و قال و بحث و نزاع ہی سے ایک مسئلہ نکھر کر سامنے آئے گا۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا جاگیرداری کو شمشیر فاروقی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ فاروق نے جاگیرداری کے خلاف جو اجتہاد کیا تھا اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب عراق، شام، ایران اور مصر فتح ہوئے تو اس وقت مجاہدین کی تعداد چند ہزار ہی تھی۔۔۔ مسلمانوں کی فوج کی تعداد لاکھوں تک نہ پہنچی تھی۔ مجاہدین نے کہا کہ یہ تمام زمینیں اور علاقے ہم نے فتح کیے ہیں، سب مال غنیمت ہیں۔ اس میں سے بیت المال کا حصہ صرف ۱/۵ ہے، باقی چار حصے جنگ میں حصہ لینے والے مجاہدین کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ ساری زمین اور اس کے کاشتکار مجاہدین میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ کاشتکار ہمارے غلام اور زمینیں ہماری جاگیر ہوں گی۔ ابتدا میں یہ مطالبہ حضرت بلالؓ اور ان کے کچھ ساتھیوں نے کیا۔ پھر یہ مطالبہ زور پکڑ گیا۔ عشرہ مبشرہ میں سے حضرت زبیر بن العوام اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما بھی کھڑے ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اجتہادی بصیرت نے عام مجاہدین کی اس رائے کو ناپسند کیا اور حضرت عمرؓ کا مقام وہ ہے جس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

"الحق ینطق علی لسان عمر"
یعنی "حق عمرؓ کی زبان سے گویا ہوتا ہے۔"

آپؐ نے مزید یہ بھی فرمایا ہے کہ :

"لو کان بعدی نبی لکان عمر"
یعنی "میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے"

چنانچہ اس نازک مسئلہ میں حضرت عمرؓ کی بصیرت کا مشاہدہ سب ہی نے کر لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر اس وقت مجاہدین کا مطالبہ مان لیا جاتا تو عالم اسلام میں دنیا کا بدترین جاگیردارانہ نظام قائم ہو جاتا۔ مگر حضرت عمرؓ نے اس مطالبہ کی سخت مخالفت کی۔ ان کا اجتہاد قرآن پر مبنی تھا۔ جس سے ان کے مطالعہ قرآن کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

قرآن حکیم میں "اموال فے" کا حکم سورۂ حشر میں بیان ہوا ہے جو کل کا کل بیت المال میں داخل کیا جاتا ہے اور مجاہدین میں اسے تقسیم نہیں کیا جاتا۔ امیرالمومنین حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ مفتوحہ علاقے مال غنیمت نہیں بلکہ مال فے ہیں۔ مال غنیمت کا اطلاق صرف ان اموال پر ہوگا جو عین محاذ جنگ میں ہاتھ آئیں۔ ان اموال میں جنگی آلات مثلاً تلواریں، نیزے اور ڈھالیں وغیرہ یا دشمن اپنے کھانے کے لئے جو مال مویشی بھیڑ بکری ساتھ لاتا ہے۔ اسی طرح سواری اور باربرداری کے جانور اونٹ، گھوڑے، اور خچر وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ زمین وغیرہ "فے" ہیں جو کل بیت المال کی ملک ہے۔ یہ کسی کی انفرادی ملک نہیں ہیں۔

حضرت عمرؓ کی اس رائے کی تائید اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ رضوان اللہ علیہم بھی کر رہے تھے۔ لیکن ان جلیل القدر صحابہ کی رائے کے باوجود اس معاملہ پر بہت ردوقدح ہوا۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔ حضرت عمرؓ اپنی رائے کے حق میں چٹان کی طرح کھڑے ہو گئے۔ بالآخر اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے حضرت عمرؓ نے ایک "لینڈ کمیشن" مقرر کیا۔ اس کمیشن میں کسی مہاجر کو شامل نہیں کیا گیا کیونکہ زراعت پیشہ نہ ہونے کی وجہ سے زراعت کے مسائل سے ناواقف تھے۔ یہ حضرات مکہ سے ہجرت کر کے آئے تھے اور اس وادی غیر ذی زرع میں تجارت اور کاروباری ذریعہ معاش تھا۔ کمیشن میں پانچ انصاری قبیلہ خزرج میں سے اور پانچ انصاری قبیلہ اوس میں سے شامل کئے گئے۔ اس لینڈ کمیشن نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کیا اور اسی پر اجماع ہو گیا۔ اس اجتہاد کی رو سے اسلامی قانون میں زمین کی مستقل دو قسمیں تاقیام قیامت وجود میں آ چکی ہیں۔

زمینوں کی دو اقسام

زمین کی ایک قسم وہ ہے جس کے مالک کسی جنگ و جدال کے بغیر ایمان لے آئے ہوں۔ ایسی زمین انہی کی ملکیت شمار ہوگی اور اس کی پیداوار میں سے عشر وصول کیا جائے گا ایسی زمین کو عشری زمین کہا جاتا ہے۔

اس قسم کی زمین کی سب سے نمایاں مثال مدینہ منورہ کی زمینیں ہیں۔ مدینہ کو نبی اکرم ﷺ نے فتح نہیں کیا تھا بلکہ وہاں کے لوگوں نے خود آنحضرت کو مدینہ آنے کی دعوت دی تھی۔

عشر دو طرح کا ہوتا ہے۔ جو زمین بارش یا قدرتی ذرائع سے سیراب ہوتی ہو تو اس سے پورا عشر یعنی پیداوار کا ۱۰فی صد وصول کیا جائے گا۔ لیکن جس زمین کی آبپاشی مصنوعی طریقہ پر ہو، جس میں کاشتکار کو اخراجات ادا کرنے پڑیں مثلاً آبیانہ ادا کرنا پڑے یا ڈیزل، بجلی خرچ ہو تو اس پر نصف عشر یعنی پیداوار کا ۵ فیصد وصول کیا جائے گا۔

زمین کی دوسری قسم وہ ہے جسے خراجی کہا جاتا ہے۔ یہ ان علاقوں اور ملکوں کی زمینیں ہیں جو بزور شمشیر فتح ہوئے ہیں۔ ایسی زمینیں مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت ہیں گویا یہ اسلامی ریاست کی ملکیت ہیں۔ اس زمین میں کسی کا ایک انچ ملکیتی رقبہ نہیں ہے۔ جو لوگ پہلے سے ان زمینوں پر قابض تھے وہ عیسائی ہوں، مجوسی ہوں، قبطی ہوں یا یہودی ہوں وہ کاشت کار کی حیثیت سے ہوں گے اور وہ زمین کا خراج براہ راست خود بیت المال کو ادا کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ خراج کی شرح اسلامی حکومت اپنے اجتہاد سے مقرر کرے گی۔ مسلمانوں کا بیت المال نظام خلافت کا سب سے بڑا source of revenue ہوگا۔

حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا اجتہاد کی روشنی میں مسلمانان پاکستان کے لئے زمینوں کا مسئلہ حل کرنا مشکل نہیں رہا۔ ہم اس مسئلہ کو شریعت کے مطابق حل کر سکتے ہیں۔ اسلامی شریعت کی رو سے پاکستان کی ایک انچ زمین کسی کی ملکیتی زمین نہیں ہے کیونکہ پاکستان کے تمام علاقے بزور شمشیر فتح ہوئے تھے۔ اب کسی اور دلیل سے ملکیت ثابت نہیں کی جا

سکتی۔ یہ زمین خراجی ہے جو کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ یہ ہے وہ شمشیر فاروقی جسے ہاتھ میں لے کر اراضی کا ایک نیا بندوبست کیا جا سکتا ہے، جس سے جاگیرداری کی جڑ کٹ سکتی ہے۔ جو لوگ اب تک اس اصول کے خلاف زمینوں پر ملکیت کا دعویٰ کر کے اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں ان کو اسی قسم کی چھوٹ دی جا سکتی ہے جیسی اللہ تعالیٰ نے سود پر قرض دینے والوں کو رعایت دی تھی یعنی جو سود پہلے لیا جا چکا ہے اسے معاف کیا جاتا ہے۔ آئندہ کے لئے سود لینا قطعی حرام ہے۔ زمینوں کی آمدنی کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا۔ اب مستقبل میں زمینوں پر تمام قابض لوگوں کی حیثیت کاشتکاروں کی ہے اور اسی حیثیت میں وہ زمینوں سے استفادے کے مجاز ہوں گے۔

نئے بندوبست اراضی کے بعد جو لوگ پہلے سے زمین کاشت کر رہے ہیں وہ بعد میں بھی زمین کاشت کرتے رہیں گے آخر وہ بھی مسلمان ہیں اور اسی معاشرے کے افراد ہیں۔ اس ضمن میں یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اچھی طرح گزارے کے لائق صحیح یونٹ کتنے ایکڑ پر مشتمل ہونا چاہئے۔ جو پیداوار کے اعتبار سے اور انتظامی اعتبار سے بہتر ہو، وہ یونٹ سب کو دیا جائے۔ اب کاشتکار اور بیت المال کے بیچ میں نہ کوئی جاگیردار ہوگا نہ زمیندار۔ بلکہ خراج براہ راست بیت المال کو ادا کیا جائے گا۔ اس طرح بہت سی لعنتی قسم کی کٹوتیوں اور ٹیکسوں سے کاشتکار کی جان چھوٹ جائے گی۔

اس وقت ہمارے ملک میں علمائے کرام نے پاکستان کی زمینوں کی شرعی حیثیت کے حوالے سے بحث شروع کر دی ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ اس معاملے پر کھل کر بحث ہو تاکہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے۔ مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے اور انہوں نے پاکستان کی زمینوں کو عشری قرار دیا ہے۔ ان کے دلائل اپنی جگہ لیکن آزادانہ بحث و مباحثہ بہرحال ضروری ہے۔

میں اس بحث میں ایک حوالہ پچھلی صدی کے ہندوستان کے چوٹی کے علماء میں سے قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کا دینا چاہتا ہوں۔ قاضی صاحب محتاج تعارف نہیں ہیں۔ تفسیر مظہری کے مصنف اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور

خلیفہ مجاز تھے۔ انھوں نے فقہ کے بنیادی مسائل پر ایک رسالہ "مالا بد منہ" کے نام سے لکھا ہے۔ اس رسالے میں آپ لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کی ساری زمینیں چونکہ خراجی ہیں اس لئے میں عشر کے مسائل نہیں لکھ رہا ہوں" فقہ کا یہ رسالہ آج بھی ہمارے تمام قدیم مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔

پاکستان کی زمینوں کے حوالے سے علمی سطح پر گفتگو ضرور ہونی چاہئے بلکہ ان زمینوں کی شرعی حیثیت کا اب باقاعدہ فیصلہ ہو جانا چاہئے۔ میں نے ضیاء الحق مرحوم کی شوریٰ میں یہ تجویز دی تھی کہ آپ ایک لینڈ کمیشن بنائیے۔ اس کمیشن میں پاکستان کے نہ صرف جید علماء کو شامل کیا جائے بلکہ بندوبست اراضی کے ماہرین کی خدمات بھی لی جائیں۔ علماء وہ شامل کئے جائیں جو اجتہادی بصیرت رکھتے ہوں اور جو قرآن و سنت کے اصل اہداف کو سامنے رکھ سکیں۔ پھر اس کمیشن کو آزادانہ کام (Free Hand) کا موقع دیجئے تاکہ وہ یہاں کی زمینوں کی شرعی حیثیت متعین کر دے۔ تاہم میں تو یہی عرض کروں گا کہ اس ضمن میں بھی اصل ذمہ داری ان مذہبی سیاسی جماعتوں پر ہے جو اپنے اپنے منشور میں یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ وہ زمین کی ملکیت کی ایک حد متعین کر دیں گے۔ جبکہ اس تحدید کے لئے دلیل ان کے پاس کوئی نہیں ہے۔

قمار (یا) جوا

اب میں ان تین باتوں میں سے تیسری بات کی طرف آتا ہوں جس کو نکال دینے سے ہر معاشی نظام کو نظام خلافت کے معاشی ڈھانچے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ وہ تیسری چیز ہے جوئے کا خاتمہ۔[۲]

دور ملوکیت کے مفاسد

یہ تو میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ دور ملوکیت کے آغاز ہی میں اسلامی تاریخ بہت سے صدمات سے دوچار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ کربلا کا واقعہ، حرہ کا واقعہ، حضرت عبداللہ بن زبیر کی شہادت، پھر حجاج بن یوسف کے ہاتھوں سینکڑوں تابعین کا شہید ہونا،

اس کے علاوہ حضرت محمد بن قاسم رحمتہ اللہ علیہ کی شہادت کا واقعہ۔ یہ تمام خرابیاں اور حادثات اپنی جگہ لیکن میرے نزدیک دورِ ملوکیت کی اصل خرابیاں مالیاتی ہیں۔ بنو امیہ کا دور تو ملوکیت کا نقطۂ آغاز تھا۔ ملوکیت نے گہری جڑیں تو دورِ بنو عباس میں پکڑی تھیں۔ ابتداء میں نہ کوئی شرک کا فتنہ تھا، نہ کوئی باطل عقائد اسلام میں در آئے تھے۔ نہ معتزلہ پیدا ہوئے تھے نہ بدعات کا طوفان کھڑا ہوا تھا۔ ایک طرف خرابی صرف سیاسی اور دستوری سطح پر آئی تھی کہ خلافت شورائی نہیں رہی تھی موروثی ہو گئی تھی۔ لیکن دوسری طرف سب سے بڑی خرابی مالیاتی امور میں در آئی تھی۔ اس ضمن میں ایک بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ جاگیرداری کی حیثیت ملوکیت کے لئے پاؤں کی ہے۔ گویا سب جاگیردار ملوکیت کے "پاؤں" ہوتے ہیں۔ لہٰذا دورِ ملوکیت میں پہلا کام یہ ہوا کہ بڑے بڑے رقبے دے کر لوگوں کو نوازنا شروع کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے پہلے اور آخری صاحبِ اختیار مجدد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ رحمتہ اللہ علیہ کا دوسرا تجدیدی کارنامہ [۳] یہی تھا کہ اس وقت تک جتنی بھی جاگیریں عطا کی گئی تھیں ان سب کی دستاویزات منگائیں اور قینچی سے کتر کتر کر ان کا ڈھیر لگا دیا۔

فقہ پر ملوکیت کے اثرات

علامہ اقبال، جن کو مصورِ پاکستان کا لقب بھی دیا گیا ہے انہوں نے مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد کی صدارت کرتے ہوئے ۱۹۳۰ء میں سب سے پہلے پاکستان کا نام لئے بغیر پاکستان کا تصور پیش کیا تھا۔ اسی خطبہ الٰہ آباد میں انہوں نے ایک اور اہم بات کی تھی انہوں نے فرمایا تھا:

> "اگر ہم ایک ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہمارے لئے یہ موقع پیدا ہو جائے گا کہ ہم اسلام کی اصل تعلیمات جن پر دورِ ملوکیت اور عرب امپیریلزم (Arab Imperialism) کے دوران پردے ڈال دیئے گئے تھے ان کو ہٹا کر اسلام کی صحیح صورت دنیا کے سامنے پیش کریں"۔

یہ ہے علامہ اقبال کا پاکستان کے بارے میں تصور جس کی طرف ابھی تک ہمارا رخ

بھی نہیں ہوا۔ علامہ اقبال کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام پر عرب ملوکیت کے اثرات کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملوکیت نے ہماری فقہ پر بھی اثرات ڈالے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت امام ابو حنیفہ نے سختیاں جھیلیں، جیل جانا قبول کیا، مگر قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول نہیں کیا، جبکہ ان کے شاگرد نے یہ عہدہ بہرحال قبول کیا۔ میں قاضی امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کی نیت پر ہرگز حملہ نہیں کر رہا۔ مگر انہوں نے اپنی مصلحت، امت کی مصلحت یا حالات کا تقاضا سمجھ کر یہ عہدہ بہرحال قبول کیا۔ اس طرح امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے طرز عمل میں بہرحال فرق تو واقع ہو گیا۔ اب قاضی ابو یوسف ملک کے چیف جسٹس ہیں، لیکن جو برائی آچکی ہے وہ اس کو دفع کیسے کریں؟ چنانچہ "نظریہ ضرورت" کے تحت قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ نے بعض کڑی شرائط لگا کر مزارعت کے جواز کا فتویٰ دے دیا ہے۔ ان شرائط میں مثلاً یہ شرط بھی ہے کہ مالک زمین، بیج بھی مہیا کرے اور مزید فلاں فلاں چیزیں بھی مالک کے ذمے ہیں تاکہ اگر فصل تباہ ہو تو کچھ نہ کچھ نقصان زمیندار کو بھی تو اٹھانا پڑے۔ سارا تاوان بیچارے کاشتکار پر تو نہ آئے۔

یہ "نظریہ ضرورت" آج بھی موثر ہے۔ چنانچہ جب مارشل لاء آجاتا ہے تو ہماری عدالت عظمیٰ بھی اس کو اسی نظریہ ضرورت کے تحت قبول کر لیتی ہے۔ اب عدالت فوج سے لڑ تو نہیں سکتی۔ ایسی صورت میں عدالتیں زیادہ سے زیادہ کچھ شرطیں لگا سکتی ہیں مثلاً یہ کہ انتخابات نوے دن کے اندر کرائے جائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ نوے دن پھیلتے پھیلتے گیارہ سال پر محیط ہو جائیں۔

یہ بعینہٖ وہی چیز ہے جس کو پہلے بھی میں بیان کر چکا ہوں کہ ہمارے فقہاء نے متغلب کی اطاعت کو بھی ضروری قرار دیا ہے کیونکہ بدامنی اور انارکی بہرحال قابل قبول نہیں۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں یہی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ملوکیت کا راستہ روکنے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ان ملوک کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا۔

بہرحال میرے نزدیک مزارعت زمین کا سود ہے۔ اس ضمن میں نبی ﷺ کی حدیث مبارکہ بھی موجود ہے۔ اگرچہ بعض حضرات نے اس حدیث کی ایک دوسری

تاویل کی ہے۔ حدیث یہ ہے کہ

> "ایک دفعہ نبی کریم ﷺ نے حضرت رافع بن خدیج ؓ کو ایک کھیت میں کام کرتے دیکھا۔ آپ حیران ہوئے کہ حضرت رافع بن خدیج تو مہاجر ہیں۔ آپ نے سوال کیا یہ کس کا کھیت ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ یہ زمین فلاں فلاں انصاری کی ہے۔ میں اس پر محنت کر رہا ہوں۔ پیداوار ہمارے درمیان تقسیم ہو جائے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "فقد اربیتما" تم دونوں نے تو یہ سودی معاملہ کیا ہے اور مزید ارشاد فرمایا "رد الارض الی اھلھا" زمین اس کے مالک کو واپس کر دو"۔

بعض حضرات نے اس حدیث مبارکہ کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ ممانعت ایک مخصوص قسم مزارعت کے لئے تھی جس کی رو سے تقسیم پیداوار کا طریقہ یہ تھا کہ نالیوں کے پاس پیدا ہونے والی فصل مالک زمین کو اور دور دور پیدا ہونے والی فصل کاشتکار کو دی جائے گی۔ اس تاویل سے حدیث کو خاص کر لیا گیا۔ ورنہ خود حدیث کے الفاظ تو عام ہیں بہرحال آپ کے سامنے میں نے اپنی رائے رکھ دی ہے۔

ہم نے اس موضوع پر مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ کی ایک کتاب "مروجہ نظام زمینداری اور اسلام" کے نام سے شائع کی ہے۔ انھوں نے جو بات کی ہے دلائل سے کی ہے۔ کتاب کی اشاعت سے قبل ہم نے اسے پہلے "حکمت قرآن" اور "میثاق" میں شائع کیا تھا۔ اور وہ شمارے جن میں یہ مضامین شائع ہوئے تھے بعض علماء کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے۔ متعدد علماء نے ان مضامین پر بڑی تنقید کی اور ان کو غلط قرار دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ تنقید لکھیں تا کہ ہم اس کو شائع کریں مگر تنقید لکھنے کی زحمت کسی نے نہ کی۔

بیع موجل اور بیع مرابحہ

جیسا میں نے عرض کیا کہ ہم نے عہد حاضر میں اہم مسائل پر گفتگو کا آغاز کیا ہے تا کہ بات نکھر کر سامنے آئے۔ اس وقت ایک بحث بیع موجل اور بیع مرابحہ کے حوالے سے بھی جاری ہے۔

بیع موجل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اگر آپ کوئی چیز نقد رقم ادا کر کے لیں تب تو مثلاً آپ سے ۱۰۰ روپیہ قیمت وصول کی جائے گی لیکن اگر آپ قیمت سال بھر کے بعد ادا کریں تو قیمت مثلاً ۱۲۰ روپیہ وصول کی جائے گی۔ ہمارے ہاں اس کے جواز کا بھی فتویٰ دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں، میں یہ عرض کروں گا کہ عقل اور منطق کے استدلال سے اس میں اور سود میں فرق کیا ہے؟ وہ چیزیں جو بازار میں نقد قیمت پر دستیاب ہیں، ان کو اگر آپ قسطوں پر لیں اور قیمت زیادہ ادا کریں، تو قیمت میں جو اضافہ ہے اسے سود کے علاوہ اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟ عجیب بات یہ ہے کہ اس جواز کا کوئی متعین فتویٰ بھی نہیں ہے۔ بس ایک عبارت کہیں سے نکلی ہے جس کے الفاظ کچھ اس طرح پر ہیں "کیا تم دیکھتے نہیں کہ اس کا رواج ہے" اب اس عبارت کو لے کر ہمارے ہاں سارا قسطوں کا جو کاروبار ہو رہا ہے اس کا جواز ڈھونڈا جا رہا ہے۔ اسی سے ضیاء الحق صاحب نے سود کو مشرف باسلام کیا ہے۔ آپ کسی بینکار سے PLS کے حوالے سے پوچھ لیں، وہ صاف کہے گا کہ سود ہے، ہم نے صرف نام تبدیل کیا ہے۔ اس طرح مختلف فقہی حیلوں سے بیع موجل کے جواز کا فتویٰ دیا جا رہا ہے۔

صرف ایک صورت استثناء کی یہ ہو سکتی ہے کہ ایک چیز جو نقد مل ہی نہیں رہی ہے یا کوئی چیز ایسی ہے جس کی نقد اور ادھار قیمت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مثلاً معاملہ یوں طے ہوا ہو کہ قیمت جو بھی آج طے ہو گئی ہے اس کی ادائیگی ایک سال بعد ہو گی تو یہ صورت بہرحال سود کی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ اگر طے شدہ مدت میں قیمت کی ادائیگی نہ ہوئی اور اس میں کچھ اضافہ کرنا پڑا تو مدت ادائیگی میں اضافے کی وجہ سے قیمت میں اضافہ نہ کیا جائے گا کیونکہ یہ اضافہ سود ہو گا۔

اسی طرح کا معاملہ "بیع مرابحہ" کا ہے۔ بیع مرابحہ کیا ہے؟ اس کو آپ یوں سمجھے کہ مجھے بازار سے کوئی چیز خریدنی ہے، لیکن میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ آپ بازار سے خرید کر مجھے لا دیجئے۔ میں اس پر آپ کو اتنا نفع دے دوں گا۔ مثلاً آپ سو روپیہ کی چیز خرید لیتے ہیں تو میں آپ کو دس روپیہ زائد دے دوں گا۔ یہ دراصل اس شخص کی محنت کا معاوضہ ہے اور بالکل جائز ہے۔ اسے ایک طرح کی وکالت سے بھی

تعبیر کیا جا سکتا ہے مگر اس وقت اسی کو بنیاد بنا کر بینکنگ کے نظام کو "نام نہاد اسلامی" بنا دیا گیا ہے جو نظام سود پر مبنی ہے۔

دور ملوکیت کے باقیات سیئات

اس حوالے سے میں علامہ اقبال کا ذکر کر چکا ہوں۔ انہوں نے اس دور میں بہت گہری حقیقت تک رسائی حاصل کی تھی۔ دور ملوکیت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال نے انہیں خوب سمجھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے خود ابلیس کی زبان سے اپنی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں کہلوایا تھا ~

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستیں

میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ دور ملوکیت میں یہ چیزیں رفتہ رفتہ ہمارے ہاں در آئی ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہم نے انہیں کل دین سمجھ لیا ہے۔ جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن و سنت کے اصل اہداف کی طرف پلٹا جائے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ عہد حاضر میں عوام کی فلاح و بہبود اور عدل و قسط کے تقاضے کیا ہیں۔ آج کے دور میں اصل اہمیت اجتماعی نظام کی ہے۔ اس کے علاوہ خود شریعت کے نزول کا مقصد ہی نظام قسط و عدل کا قیام ہے۔ چنانچہ سورۃ حدید کی آیت نمبر ۲۵ میں ارشاد ربانی ہے :

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ
وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾

"ہم نے اپنے رسولوں کو معجزات اور واضح تعلیمات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل اور قسط پر قائم ہوں"

اس کے برعکس اگر "Haves and have nots" کے درمیان گہری خلیج موجود ہے، انسانیت مترفین اور محرومین، مستضعفین اور مستکبرین میں تقسیم ہے تو ظاہر بات ہے کہ نزول شریعت کا اصل مقصد تو حاصل نہیں ہو رہا ہے۔

موجودہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام میں بھی ایک اچھی چیز موجود ہے اگرچہ اسلام نے وہ چیز اس سے بہتر انداز میں عطا کی ہے۔ مغربی سرمایہ داری نظام میں وہ چیز بے روزگاری الاؤنس (Unemployment allownce) ہے۔ اس وقت تقریباً تمام یورپی ممالک میں اجتماعی بہبود (ویلفیئر) کا نظام کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے، جبکہ یہ نظام اعلیٰ ترین شکل میں اسکینڈے نیوین ممالک میں موجود ہے۔ چنانچہ ان ممالک میں جس اسکول کے اندر ایک Billionare کا بچہ پڑھتا ہے اسی اسکول میں اس شخص کا بچہ بھی پڑھتا ہے جس کی گزر اوقات محض welfare allownce پر ہے۔ یہی معاملہ علاج معالجہ اور دیگر بنیادی سہولیات میں بھی کارفرما ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک فلاحی ریاست کی جو بلند ترین سطح ممکن ہے وہ Scandanavian countries میں موجود ہے۔ برطانیہ بھی اس کے آس پاس نہیں پہنچ سکا جبکہ امریکہ تو ابھی بہت دور ہے۔

اسلام نے بھی یہی شے اس سے بہتر انداز میں عطا کی ہے، مغربی سرمایہ دارانہ نظام میں اسے Internal Management of Capital کی اصطلاح سے پہچانتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر کھلے مقابلے کا ماحول ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کچھ لوگ بہت آگے چلے جائیں گے اور کچھ پیچھے رہ جائیں گے۔ اب اس gap کو کم کرنے کے لئے کوئی feed back تو چاہئے، ورنہ ان دو طبقات میں خلیج زیادہ ہو جانے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ بھوکے، پیٹ بھروں کا پیٹ چاک کریں گے۔ لہٰذا اب ان کو کچھ کھلا پلا کر چپ رکھنا ہے۔ دراصل یہ سرمایہ دارانہ نظام کی ناگزیر ضرورت ہے۔ اسلام نے اسی مقصد کو زکوۃ کے ذریعہ پورا کیا ہے۔ اسلام نے زکوۃ کو محض ٹیکس کے طور پر لاگو نہیں کیا بلکہ اس کو عبادت کا درجہ دیا ہے۔ اس وقت سرمایہ دارانہ نظام میں ٹیکس سے بچنا تو آدمی اپنا حق سمجھتا ہے! چنانچہ اس مقصد کے لئے مختلف قانونی ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں۔ سرمایہ داروں کی مدد کے لئے بڑی بڑی فرمیں ہوتی ہیں جو بڑی بھاری فیسیں لے کر انہیں راستے بتاتی ہیں کہ اس طرح کرو گے تو ٹیکس سے بچ نکلو گے اس کے برخلاف اسلام نے زکوۃ کو عبادت کا درجہ دیا ہے، لہٰذا کوئی مسلمان اس کو Avoid نہیں کرے گا۔

زکوۃ کی حقیقت

اب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ زکوۃ اصل میں ہے کیا؟ زکوۃ کے بارے میں حدیث رسولؐ میں ہے :

> تؤخذ من اغنیاءھم وترد علی فقراءھم
>
> "(زکوۃ) ان کے اغنیاء سے لی جائے گی اور انہی کے فقراء میں تقسیم کر دی جائے گی"۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ غنی سے مراد Billionares نہیں ہے نہ ہی فقیر سے مراد اس قدر بھوکا ہے کہ فاقے آ رہے ہوں بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک واضح خط کھینچ دیا گیا ہے۔ اگر آپ کے پاس سات تولے سونے یا باون تولے چاندی کی مالیت ہے تو آپ معطی (doners) میں شامل ہیں۔ گویا آپ غنی ہیں۔ لیکن اگر اس مالیت کے مالک نہیں ہیں تو آپ عطیہ لینے کے حقدار (recipient) ہیں۔ اس طرح دینے والے اور لینے کے حقدار کے درمیان ایک فصیل کھینچ دی گئی ہے۔

اس موقع پر یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اس زکوۃ کے نظام پر بہت بڑا ظلم ہمارے مرحوم صدر ضیاء الحق نے کیا ہے۔ زکوۃ آرڈی نینس اور زکوۃ کے نظام کو خالص اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ایک منظم بھیک کا نظام وجود میں آ گیا۔ زکوۃ کا اصل نظام کفالت عامہ کے لئے ہے۔ اسلامی ریاست کو اپنے تمام شہریوں کی بنیادی ضروریات کی ذمہ داری قبول کرنا پڑے گی۔ ہمارے ہاں کسی زمانے میں روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگایا گیا تھا۔ یہ نعرہ غیر اسلامی ہرگز نہیں تھا۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ نعرہ لگانے والے جاگیردار تھے۔ ان جاگیرداروں نے اپنے وقتی سیاسی مقاصد کے لئے اس نعرے کو استعمال کیا۔ ان میں کسی کی نیت کچھ کر گزرنے کی نہ تھی ورنہ ضرور کچھ نہ کچھ عملی اقدامات کئے جاتے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ زکوۃ کے نظام کے ساتھ جو کچھ ضیاء الحق مرحوم نے کیا وہ اس سے بھی بدتر ہے۔ اس شخص نے زکوۃ کے نظام کو بدنام کیا ہے۔ ضیاء الحق کا زکوۃ کا نظام یہ ہے کہ "Fixed deposit" کے اندر سود کا

ایک حصہ لے کر اسے زکوٰۃ کا نام دے دیا گیا۔ جبکہ زکوٰۃ کا اصل نظام نافذ ہی نہیں کیا گیا۔

زکوٰۃ کا اصل نظام

زکوٰۃ کا اصل نظام ہے کیا؟ وہ نظام یہ ہے کہ تمام اموال تجارت پر اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ نافذ کی جائے گی۔ فرض کیجئے آپ کی دوکان میں پانچ لاکھ کا مال پڑا ہوا ہے۔ آپ سے اڑھائی فیصد کے حساب سے لیا جائے گا۔ اس طرح آپ کی انکم (ٹیکس) سے کوئی بحث سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس بات کا بھی امکان ہے انکم تو کجا گزشتہ سال چھ لاکھ کا مال رہا ہو اور اس سال پانچ لاکھ کا رہ گیا ہو۔ زکوٰۃ ایک لاکھ کے خسارے کے بعد بھی دینی ہو گی۔ جب تک کوئی شخص صاحب نصاب ہے اسے زکوٰۃ ادا کرنی ہو گی۔ اگر کوئی نصاب سے نیچے ہے تو اب اس کا شمار لینے والوں میں ہو جائے گا۔ آپ کے پاس جتنا بھی مال تجارت گودام میں یا دوکان میں ہے آپ کو اس کا اڑھائی فیصد دینا ہو گا۔ اگر کوئی کارخانہ ہے تو مشنری، زمین اور عمارت مستثنیٰ ہوں گے۔ اس کے علاوہ جتنا بھی خام مال اور تیار شدہ مال موجود ہے اس سب پر زکوٰۃ نافذ ہو گی۔

زکوٰۃ کے نظام کو اگر اس کی اصل روح کے ساتھ نافذ کر دیا جائے تو سکینڈے نیوین ممالک سے کہیں بہتر ویلفیئر کا نظام لایا جا سکتا ہے۔ اس ویلفیئر کے نظام کا فائدہ یہ ہو گا کہ دولت گردش میں آئے گی۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر عوام کی قوت خرید میں اضافہ ہو گا تو اس سے کاروبار میں تیزی آئے گی۔ اس طرح اس کی برکات پھر لوٹ کر پورے معاشرے میں پھیل جائیں گی اور پورے معاشرے میں خوشحالی آئے گی۔ اس خوشحالی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ بھی معاشرے کا جزو ہونے کی وجہ سے مستفید ہوں گے اور آپ کو بھی feed back مل جائے گا۔

زکوٰۃ کے نظام کے حوالے سے ایک بات اور بھی سمجھ لینی چاہئے کہ مال کی دو قسمیں ہیں بالکل اسی طرح جیسے زمین کی دو قسمیں ہیں۔ مال کی دو قسمیں یہ ہیں (i) اموال ظاہرہ اور (ii) اموال باطنہ۔ مال کی ان دونوں اقسام کو سمجھنے سے تاریخ اسلام کے اس واقعہ کی حقیقت بھی سمجھ میں آ جائے گی کہ خلافت راشدہ کے دور میں لوگ زکوٰۃ لئے پھرتے

تھے مگر زکوٰۃ لینے والا نہ ملتا تھا۔ خلافت راشدہ میں زکوٰۃ تو بیت المال وصول کرتا تھا پھر زکوٰۃ لے کر پھرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس سوال کا جواب اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ کی تقسیم سمجھنے سے واضح ہو جائے گا۔

اصل بات یہ ہے کہ اموال ظاہرہ یعنی وہ مال جو مخفی نہیں ہے مثلاً سامان تجارت جو دوکان یا گودام میں موجود ہے۔ اس مال کو جیب میں یا تکیے کے نیچے رکھ کر چھپایا تو نہیں جا سکتا۔ اسی طرح مویشیوں کے گلے ہیں ان کی گنتی بھی با آسانی ممکن ہے۔ اسی طرح کارخانے میں جن کی مصنوعات آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اتنا دھاگہ ہے' اتنا کپڑا ہے' اتنی روئی ہے' چنانچہ یہ اور اسی طرح کے تمام اموال ظاہرہ پر نظام خلافت میں زکوٰۃ عائد کی جائے گی اور جبراً بھی وصول کی جائے گی کیونکہ نظام خلافت کے تحت ہر انسان کی بنیادی ضروریات زندگی کی کفالت ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے زکوٰۃ جبراً بھی وصول کی جائے گی[۱۲] یہ جبری وصولی اموال ظاہرہ سے ہی کی جائے گی۔ اور ایک ایک پائی کا حساب لیا جائے گا۔

لیکن اموال کی دوسری قسم "اموال باطنہ" جیسے کہ وہ نقدی یا زیور جو آپ نے اپنے گھر میں کسی آڑے وقت کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ ان کی تلاشی نہیں لی جائے گی نہ ان اموال کی زکوٰۃ جبراً وصول کی جائے گی۔ یہ آپ کا اور اللہ کا معاملہ ہے۔ اس میں آپ کو یہ آزادی حاصل ہے کہ چاہیں تو زکوٰۃ ریاست کو دے دیں چاہیں تو اپنے طور پر دے دیں۔ یہی اموال باطنہ تھے کہ جن کی زکوٰۃ لوگ لے کر پھرتے تھے لیکن کوئی قبول کرنے والا نہیں ملتا تھا۔

نظام زکوٰۃ کا ایک اور امتیاز

یہاں میں یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ اسکینڈے نیوین ممالک کا سوشلزم یا ویلفیئر کا نظام زیادہ نہیں چل سکتا۔ میں نے کئی سال پہلے یہ بات کہی تھی کہ ویلفیئر کی اتنی بلند سطح برقرار رکھنا مشکل ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرے میں وہ طبقہ پیدا ہو جائے گا اور بڑھتا چلا جائے گا جو کام کیے بغیر اس ویلفیئر نظام ہی سے استفادے کو کافی سمجھ لے گا اور حکومت کے

اس نظام سے استفادے کو اپنا حق سمجھنے کی وجہ سے کسی بھی الاؤنس کی وصولی میں اسے اپنی خودداری بھی مجروح ہوتی ہوئی محسوس نہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں اب ایسے لوگ بکثرت ہو گئے ہیں جن کو حکومت روزگار دلاتی ہے لیکن وہ جلد از جلد بے روزگار ہو کر بے روزگاری الاؤنس وصول کرنے لگتے ہیں۔

اس کے برخلاف اسلام نے اگرچہ اغنیاء پر زکوٰۃ کو فرض قرار دیا ہے لیکن زکوٰۃ لینے والوں سے کہا ہے کہ یہ تمہاری غیرت کی نفی ہے کہ تم لینے والے بنو اور زکوٰۃ قبول کرو اسلام چاہتا ہے کہ انسان اپنے پاؤں پر کھڑا ہو اور کسی کا محتاج نہ رہے۔ نبی ﷺ نے ہاتھ سے کمانے کی ترغیب دلائی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ "الکاسب حبیب اللہ" (روزی کمانے والا اللہ کا دوست ہے) آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ سب سے زیادہ پاکیزہ کمائی ہاتھ کی کمائی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے زرہیں بناتے تھے، خزانہ کو اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھتے تھے۔ آپ' کا یہ ارشاد بھی ہے کہ: "اوپر والا ہاتھ (دینے والا) نیچے والے ہاتھ (لینے والے) سے بہتر ہے" آپ نے زکوٰۃ کو میل کچیل قرار دیا ہے اور خود اپنے آپ پر اور اپنی اولاد کو زکوٰۃ کی وصولی سے مستثنیٰ کر لیا ہے (۵)

اسلام کا معاشرتی نظام

آج کے خطبہ خلافت کے دوسرے حصے کا تعلق نظام خلافت کے تحت معاشرتی نظام کے اصول و مبادی سے ہے۔ اسلام کے معاشرتی نظام کے حوالے سے ایک بات تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اس نظام سے کسی نہ کسی درجے میں واقف ہے۔ مثلاً ہر مسلمان پردہ اور ستر کے لازم ہونے کا علم رکھتا ہے خواہ عمل کرنے میں کوئی کتنی ہی کوتاہی کرتا ہو۔ جبکہ نظام خلافت کے تحت معاشی اور سیاسی نظام کے بارے میں اول تو عام مسلمان بہت کم جانتے ہیں۔ پھر جدید تقاضوں کے تحت ان دونوں میں اجتہاد کی شدید ضرورت بھی ہے۔ گویا ان شعبوں کے بارے میں جتنا کچھ علم ہے بھی وہ فرسودہ ہو چکا ہے اور ان احکام و

معاملات میں اجتہاد کی روشنی میں نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

ان خطبات کے آغاز ہی میں یہ بات عرض کر دی گئی تھی کہ اجتماعی نظام کی پہلی منزل عائلی نظام ہے۔ اس پہلی منزل کو امام الہند شاہ ولی اللہ "تدبیر منزل" سے تعبیر کرتے ہیں۔ پہلی منزل کے بعد بہت سے دوسرے عوامل شامل ہو کر معاشرت کو وجود بخشتے ہیں۔ پھر جب ایک معاشرہ وجود میں آتا ہے تب اقتصادی و سیاسی مسائل جنم لیتے ہیں۔ اور انہی مسائل کی کوکھ سے سیاسی و اقتصادی نظام وجود میں آتا ہے۔

معاشرتی نظام کے اصول و مبادی

اسلام کے معاشرتی نظام کے حوالے سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام میں پیدائشی طور پر تمام انسان برابر ہیں۔ گویا کامل انسانی مساوات موجود ہے۔ پیدائشی طور پر نہ کوئی اونچا ہے نہ نیچا نہ نسل کی بنیاد پر نہ رنگ کی بنیاد پر اور نہ جنس کی بنیاد پر۔ اسلام ہرگز اس بات کی کی اجازت نہیں دیتا کہ عورت کو مرد سے گھٹیا تصور کیا جائے۔ قرآن حکیم اونچ نیچ کے اس قسم کے ہر تصور کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "بعضکم من بعض" (آل عمران : ۱۹۵) یعنی تم سب ایک دوسرے ہی سے ہو۔ ایک ہی باپ کے نطفے میں سے اس کا بیٹا بھی ہے اور بیٹی بھی اور ایک ہی ماں کے رحم میں دونوں نے پرورش پائی ہے۔

یہ بات کہنے میں جتنی سادہ ہے دل و جان کے ساتھ اسے تسلیم کرنا اتنا ہی مشکل ہے۔ ہمارے ہاں ہندوؤں کو تو خوب برا بھلا کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاں برہمن اور شودر کی معاشرتی تفریق موجود ہے لیکن بالکل اسی طرح ہمارے ہاں مغل اور سید (سندھ میں امتی اور سید) کی تفریق موجود ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ خود اسلام اس تقسیم کو کسی درجے میں بھی قبول نہیں کرتا۔ اسلامی کا پہلا اصل الاصول سماجی سطح پر کامل انسانی مساوات ہے۔ اسلام کے تصور میں اگر مراتب کا کوئی فرق ہے تو وہ علم اور تقویٰ کے حوالے سے ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے :

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (الحجرات - ۱۳)

"اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تقویٰ (خدا ترسی)

میں سب سے زیادہ ہو"۔

علم اور تقویٰ وہ چیزیں جن کو آپ اپنی محنت سے کسب کرتے ہیں۔ ان کے برعکس وہ چیزیں جو آپ کو اپنے کسب کے بغیر عطا کی گئی ہیں، آپ کی پسند و ناپسند اور کسب و محنت کو ان کے حصول میں کوئی دخل نہیں ہے ان کو وجہ اعزاز و اکرام نہیں بنایا گیا۔ اللہ نے آپ کو جو رنگ اور شکل و صورت عطا کی ہے اسی طرح آپ کو جس نسل میں پیدا کر دیا گیا ہے اور آپ کی جو جنس بنا دی گئی ہے، ان چیزوں میں آپ کو کوئی اختیار قطعاً نہیں دیا گیا لہٰذا جن چیزوں میں آپ کا اختیار نہیں ہے ان کی وجہ سے کوئی اونچ نیچ کا معیار قائم نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ
شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾

(الحجرات: ۱۳)

اے لوگو! بیشک ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو قوموں اور قبیلوں کی صورت میں بنا دیا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم سب سے زیادہ صاحب تقویٰ ہو"۔

البتہ دستوری اور قانونی سطح پر مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فرق ہوگا۔ یہ فرق بھی محض انتظامی ضرورت کے تحت ہے۔ اس لئے کہ ہم کو ایک نظام چلانا ہے، اور نظام وہی چلا سکتا ہے جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتا ہو۔ اس لئے نظام خلافت چلانے کی ذمہ داری صرف مسلمانوں کی ہے۔ غیر مسلم اس نظام کو نہ چلا سکتے ہیں نہ چلانے کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن اس فرق کے حوالے سے یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہاں بھی معاملہ افضلیت یا مفضولیت کا نہیں ہے۔ کسی کو بھی یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ میں مسلمان ہوں اس لئے کافر سے افضل ہوں (ایمان کی فضیلت اپنی جگہ مگر آدم کی اولاد ہونے میں یا انسان ہونے کے ناطے کافر اور مسلم دونوں ایک ہی سطح پر ہیں) علاوہ ازیں مسلمان کو کافر سے جوہری طور پر افضل نہ قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اصل اعتبار خاتمے کا ہے۔ اور

کس کا خاتمہ کس حالت پر ہوگا اس کا کسی کو علم نہیں۔ میں الحمدللہ آج مسلمان ہوں مگر اس بات کا امکان تو موجود رہتا ہے کہ کل کو میرا پاؤں پھسل جائے اور میں گمراہی کے غار میں جا گروں اور اس بات کا بھی امکان موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کافر کے لئے ہدایت کا دروازہ کھول دیں۔ کفر و اسلام کی یہ تقسیم مستقل نہیں ہے جبکہ کالے اور گورے کی تقسیم تو مستقل ہے یہ ممکن نہیں کہ کوئی کالا گورا ہو جائے لیکن کوئی کافر کلمہ پڑھ کر اس فرق کو ایک لمحے میں ختم کر سکتا ہے۔

ایک اور تقسیم انتظامی اعتبار سے ہے۔ یہ تقسیم افسر اور ماتحت کی ہے اس تقسیم اور فرق کو ہمیں تسلیم کرنا ہوگا۔ اسی طرح شرف انسانیت کے اعتبار سے مرد اور عورت برابر ہیں۔ روحانی اور اخلاقی بلندی کے لئے میدان دونوں کے لئے کھلا ہے۔ چنانچہ سورۃ احزاب کی آیت ۳۵ میں ارشاد ربانی ہے:

﴿ان المسلمين والمسلمات والمومنين والمومنات
والقنتين والقنتت والصادقين والصادقات والصبرين
والصبرات والخاشعين والخاشعات والمتصدقين
والمتصدقات والصائمين والصائمات والحفظين
فروجهم والحفظت والذاكرين الله كثيرا والذاكرات اعد
الله لهم مغفرة واجرا عظيما ۝﴾

"بیشک مسلم مرد اور مسلم عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں، سچے مرد اور سچی عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں (اللہ سے) جھکنے والے مرد اور جھکنے والی عورتیں۔ صدقہ دینے والے مرد اور عورتیں، روزہ دار مرد اور عورتیں اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور عورتیں، اللہ نے ان سب کے لئے مغفرت اور اجر عظیم کا اہتمام کر رکھا ہے۔"

اس آیت مبارکہ میں جتنے بھی اوصاف عالیہ گنوائے گئے ہیں ان میں مرد اور عورت دونوں کو شریک کیا گیا ہے چنانچہ نہ جانے کتنے کروڑوں مرد حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ

عورت کے مقام پر رشک کرتے ہوں گے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ شرف انسانیت کے اعتبار سے مرد اور عورت برابر ہیں لیکن جب ایک مرد اور ایک عورت رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے تو اب انتظامی طور پر برابر نہیں رہے۔ اس لئے کہ اب ایک ادارہ وجود میں آ گیا ہے۔ یہ خاندان کا ادارہ (Institution of Family) ہے اور ہر ادارے کے لئے ایک سربراہ ہونا لازم ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی ادارے میں برابر کے درجے والے دو سربراہ ہوں تو اس کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔ اس لحاظ سے قرآن حکیم کی ہدایت یہ ہے کہ:

﴿الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم
على بعض وبما انفقوا من اموالهم فالصلحت قانتت
حافظت للغيب بما حفظ الله﴾

"مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس فضیلت کی بنا پر جو اللہ نے ایک کو دوسرے پر دی ہے اور اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنے اموال (خاندان کے ادارے کو قائم کرنے پر) صرف کئے ہیں۔"

یہ دراصل خاندانی ادارے کا نظم ہے اور اسی پر ہمارا فقہی نظام قائم ہے۔ خاندان کے ادارے کا سربراہ مرد ہے۔ وہ شادی کے لئے مہر ادا کرنے کا پابند ہے حالانکہ جس طرح شادی مرد کی ضرورت ہے اسی طرح عورت کی بھی ہے۔ مرد عورت کے بغیر نامکمل ہے اور عورت مرد کے بغیر۔ اس کے باوجود مہر ادا کرنے کی پابندی مرد کے لئے ہے، عورت کے لئے نہیں۔ مرد کے ذمہ کفالت بھی ہے، وہ بیوی کے نان نفقے کا ذمہ دار ہے۔ بچوں کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بھی مرد ہی پر ہے۔ اسی مصلحت سے وراثت میں مرد کا حصہ عورت سے دوگنا رکھا گیا ہے۔ یہ تمام باتیں باہم منطقی طور پر مربوط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی فلسفۂ حیات نے کسی گوشے میں کوئی جھول نہیں چھوڑا ہے۔

اسلام کے عائلی نظام کے حوالے سے علامہ اقبال نے ایک بہت اچھی بات کہی ہے۔ علامہ اقبال اپنے چھٹے لیکچر میں کہتے ہیں کہ لوگ اسلام کے عائلی قوانین پر بڑے سطحی انداز

میں غور کرتے ہیں اور اس وجہ سے وہ بہت سے اعتراضات شروع کر دیتے ہیں گہرائی میں اتر کر غور نہیں کرتے۔ اسلام نے جو بات کی ہے وہ اجمال سے کی ہے لیکن اسی اجمال کو ذرا کھول کر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اسلام کا ہر حکم یا ہدایت انتہائی معقول ہے۔ اسلام کے عائلی قوانین میں طلاق کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے عورت کو نہیں دیا گیا۔ تاہم عورت خلع حاصل کر سکتی ہے طلاق نہیں دے سکتی الا یہ کہ شادی کے موقعہ پر عورت نے بطور شرط حق طلاق منوا لیا ہو۔ یہ تمام احکام خاندان کے نظام کو مستحکم رکھنے کے لئے مرد کی قوامیت کی ضرورت کا اظہار ہیں۔

اسلام کے خاندانی نظام میں والدین کے حقوق اس نظام کا دوسرا رخ یا بعد ثانی (second dimension) ہے۔ ایک مرد اور عورت سے خاندان کی ابتداء ہوتی ہے۔ پھر اولاد ہو جانے سے (second dimension) شروع ہو جاتی ہے۔ اب والدین اور اولاد کا رشتہ بھی قائم ہو گیا پھر اولاد جب ایک سے زائد ہو جاتی ہے تو اخوت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ یہ گویا ایک خاندان کے ابعاد ثلاثہ [three dimensions] ہیں۔

اس ادارے کا استحکام مرد اور عورت کے درمیان قوی رشتہ پر منحصر ہے۔ اسی طرح جتنا اولاد اور والدین کے درمیان رشتہ مضبوط ہو گا اتنا ہی خاندان کا ادارہ مستحکم ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں چار مقامات پر اللہ کے حق کے ساتھ والدین کے حقوق کا ذکر ہے آپ حیران ہوں گے کہ ان مقامات پر رسول کا ذکر بھی نہیں ہے۔ چنانچہ سورۃ لقمان میں آتا ہے کہ ﴿ان اشکر لی ولوالدیک﴾ یعنی "شکر کرو میرا اور اپنے والدین کا" یہی مضمون سورۃ بنی اسرائیل میں آیا ہے ﴿وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا﴾ یعنی "تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو"۔ یہ سب اس لئے ہے کہ اولاد اور والدین کا رشتہ مضبوط ہو اور والدین پورے اطمینان کے ساتھ اپنے آپ کو اپنی اولاد میں پوری طرح کھپا دیں۔ وہ اپنے بڑھاپے کے لئے اس فکر کے ساتھ کچھ بچا کر نہ رکھیں کہ اس وقت کہاں سے کھائیں گے۔ انہیں اطمینان ہو کہ ان کی اولاد انہیں ان کا

بدلہ دے گی۔ سورۂ بنی اسرائیل ہی میں آتا ہے کہ ﴿رب ارحمهما كما ربياني صغيرا﴾ یعنی "اے میرے پروردگار ان دونوں پر رحم فرمائیے انہوں نے (رحم کے ساتھ) مجھے پالا پوسا جب میں چھوٹا تھا" اسی سورہ میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے: ﴿اما يبلغن عندك الكبر احدهما او كلاهما فلا تقل لهما اف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما ○ واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيرا ○﴾

اس آیہ مبارکہ کو پڑھئے اور یورپ میں جا کر دیکھئے کہ بوڑھے والدین کا کیا حشر ہوتا ہے۔ آپ ان کی حسرت اور محرومی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ وہ بیچارے سالہا سال اپنی اولاد کو دیکھنے کے انتظار میں گزار دیتے ہیں۔ وہ کرسمس کا انتظار محض اس خوشی میں کر رہے ہوتے ہیں کہ اس موقع پر بیٹے یا بیٹی کی شکل نظر آئے گی۔ لیکن قابل افسوس بات یہ ہے کہ اب اس موقع پر بھی ان کو اپنے پیاروں کی شکل دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ان کے ہاں old home میں تمام سہولتیں موجود ہیں۔ وہاں ٹی وی سیٹ لگے ہوئے ہیں۔ بہترین کھانا میسر ہے لیکن اہل یورپ یہ بات بھول گئے کہ انسانی جذبات کسی اور چیز کا بھی تقاضا کرتے ہیں۔

خاندان کے ادارے کے استحکام کے لئے ایک تیسرا عنصر ستر و حجاب کے احکام ہیں۔ اس اہم عنصر کی طرف بہت کم لوگوں کی توجہ ہے۔ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ زنا کے سدباب کے لئے عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط نہیں ہونا چاہئے۔ اس کا اہم ترین تعلق جو خاندان کی مضبوطی کے ساتھ ہے اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی(۶) اب غور کریں جس معاشرے میں بے پردگی اور عریانی ہے۔ آزادانہ اختلاط ہے اس معاشرے میں اگر کوئی مرد کسی عورت کو دیکھتا ہے اور وہ اس کی نگاہوں میں "کھب" جاتی ہے۔ تو اب اس کے خیالوں میں تو وہی بسی ہوئی ہوگی۔ ظاہر بات ہے کہ اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ بیوی پر سے توجہ ہٹ جائے گی۔ اس سے شوہر اور بیوی کے درمیان جو رشتہ الفت و محبت موجود رہنا چاہئے وہ کمزور ہوگا اور اس کے کمزور ہونے سے خاندان کا ادارہ عدم استحکام کا شکار ہو کر رہے گا۔ اس لئے اسلام نے عورت کے لئے پردے کو لازم کیا ہے تاکہ شوہر کی

پوری توجہ بیوی پر اور بیوی کی شوہر پر مرتکز رہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جنسی خواہش انسان کے اندر بہت ہی طاقتور محرک کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے ہاں جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو کہ مغربی تہذیب کا دلدادہ ہے ان کی یہ بہت بڑی علمی خیانت ہے کہ وہ ایک طرف تو فرائڈ کو جدید نفسیات کا "امام" مانتے ہیں جس کا کہنا ہے کہ انسان کے اندر سب سے طاقتور جذبہ محرکہ شہوت ہے۔ مگر یہ مغرب زدہ لوگ صریحاً علمی خیانت کرتے ہوئے اس جذبہ کو محض مولویوں کا خاصہ ظاہر کر کے ان کو بدنام کرتے ہیں اور یہ چرچا کرتے ہیں کہ مولویوں کو جنسیات کے سوا اور کوئی بات آتی ہی نہیں۔ جبکہ قرآن حکیم میں فطرت انسانی کے پیش نظر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ازواج مطہرات تک کے بارے میں احکام دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ نبی ﷺ کی بیویوں سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں امہات المومنین ہیں لیکن اس کے باوجود پردے کے پیچھے سے مانگنے کا حکم اس لئے دیا جا رہا ہے کہ

﴿ذلکم اطہر لقلوبکم وقلوبھن﴾ [الاحزاب : ۵۳)

"یہ [عمل) پاکیزہ تر ہے تمہارے دلوں کے لئے بھی اور ان کے دلوں کے لئے بھی"

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اگر شوہر اور بیوی کی توجہ منتشر نہیں ہے تو اس سے باہمی اعتماد میں اضافہ ہو گا اور یہ باہمی مودت و الفت خاندان کے ادارے کو پختگی پر منتج ہو گی۔ میاں بیوی کے اعتماد کے اس ماحول میں جو اولاد پروان چڑھتی ہے وہ نہایت صحت مند نفسیات کے ساتھ پروان چڑھتی ہے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو شوہر کا بیوی پر سے اعتماد اٹھ جائے اور بیوی کا شوہر پر سے تو آپ اندازہ لگائیں کہ اس ماحول میں جو اولاد پروان چڑھے گی اس کے اندر منفی رجحانات کے سوا کیا ہو گا۔ اس بے اعتمادی کے ماحول میں بچوں کے اندر مثبت اوصاف کہاں سے پیدا ہوں گے۔

اسلام نے عورت کے لئے یقیناً ستر و حجاب کے احکام دیئے ہیں۔ مگر ان احکام کی پابندی کے باوجود عورت کو بہت زیادہ آزادی حاصل ہے۔ عورت کاروبار کر سکتی ہے

اور وہی جائیداد رکھ سکتی ہے بس شرط یہ ہے کہ معاشرت مخلوط نہ ہو ہاں اخلاقی تعلیم یہ ہے کہ ﴿وقرن فی بیوتکن﴾ (تمہاری اصلی توجہ تمہارے گھروں پر ہونی چاہئے) یہ گھر تمہارا اصل دائرہ کار ہے۔ اگرچہ یہ کوئی قانونی پابندی نہیں ہے لہٰذا ہمارے معاشرے میں زنانہ اور مردانہ کالج علیحدہ علیحدہ موجود ہیں اور جب ہم یونیورسٹی کے علیحدہ قیام کی بات کرتے ہیں تو مغرب زدہ طبقہ کی حلق میں یہ مطالبہ نہ جانے کیوں ہڈی بن کر پھنس جاتا ہے اسی طرح سے زنانہ اور مردانہ ہسپتال بھی علیحدہ علیحدہ بنائے جا سکتے ہیں جو ہسپتال زنانہ ہوں وہاں مریض خواتین ہی کو داخلہ ملے اور ڈاکٹر بھی خواتین میں سے ہوں۔ زنانہ ہسپتالوں میں نرسیں بھی عورتوں میں سے ہونی چاہئیں جبکہ مردانہ ہسپتال میں مرد نرسوں کا اہتمام ہونا چاہئے۔ ان ہسپتالوں میں زنانہ نرسیں بہت سے فساد کی جڑ ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کیا مرد نرسنگ نہیں کر سکتے؟ جبکہ فوج میں forward medical units ہوتے ہیں جو محاذ جنگ پر جاتے ہیں' وہاں کوئی خاتون نرس نہیں ہوتی۔ حالانکہ وہاں نرسوں کی ضرورت بھی بہت شدید ہوتی ہے۔ وہاں تو آپ خواتین نرسوں کو نہیں لے جاتے جبکہ عام مردانہ ہسپتالوں میں خواتین کو بطور نرس رکھا جاتا ہے۔ آپ سوچئے کیا پی آئی اے میں کھانے اور ناشتے کی ٹرے مرد نہیں پیش کر سکتا؟(۴)

خاندانی ادارے کے اندر مزید استحکام پیدا کرنے کے لئے ان قریبی رشتہ داروں کو "محرم" قرار دیا گیا ہے جو بالعموم ساتھ ساتھ رہنے پر مجبور ہیں اور جن سے خاندان کا ادارہ تشکیل پاتا ہے اور محرم مردوں کے ساتھ نکاح کو حرام قرار دے دیا گیا ہے تاکہ ان رشتوں سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے کو ہمیشہ پاکیزہ نگاہ سے دیکھیں۔ بھائی اور بہن' ماں اور بیٹا' ساس سسر اور داماد وغیرہ۔ اگر ایک دوسرے پر سے اعتماد اٹھ جائے تو خاندان کے اندر استحکام کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔

یہ ہیں شریعت کے احکام' اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ایک دفعہ یہ طے کر لیں کہ ہمیں چلنا شریعت پر ہے یہ طے کر لینے کے بعد میں دعوے سے کہتا ہوں راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ سب کام ہوں گے لیکن علیحدہ علیحدہ دائرہ کار کے تحت ہوں گے۔ آگ اور

پالی کا یہ جوڑ جو فساد کی جڑ ہے اسے بہرحال ختم کرنا ہوگا۔ اس ضمن میں ایک بات کہی جا سکتی ہے بلکہ اکثر کہی جاتی ہے کہ آج کی دنیا معاشی دنیا ہے۔ اس معاشی دوڑ میں اگر آپ اپنی آبادی کے پچاس فیصد کو علیحدہ رکھیں گے' تو دنیا کا مقابلہ کیسے کریں گے۔ اس کا جواب میں دے چکا ہوں کہ ایک دفعہ عزم کر لیا جائے تو راستے کھلتے چلے جائیں گے۔ آپ گھریلو صنعتوں کا اہتمام کیجئے' عورتوں کو گھروں پر کام دیجئے تاکہ انہیں نکلنے کی ضرورت ہی نہ ہو اسی طرح پرائمری ایجوکیشن مکمل طور پر خواتین کے حوالے کر دی جائے مگر یہ معاملہ تیسری چوتھی جماعت تک ہی ہونا چاہئے اس سے آگے نہیں یہ بچوں کی عمر کا وہ دور ہوتا ہے جس میں ان کو شفقت و محبت کی ضرورت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے عورت کے اندر مامتا کا جذبہ رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے صنعتی یونٹ بنائے جا سکتے ہیں۔ جہاں عورتیں ہی نگرانی کریں اور عورتیں ہی کام کریں۔ اس ضمن میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ عورتوں کے اوقات کار مردوں کے مقابلے میں کم ہوں تاکہ وہ ایک بیوی اور ماں کی حیثیت سے بھی اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے وقت نکال سکیں۔

میں اپنی بات کو اس نکتے پر ختم کرتا ہوں کہ اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام عہد حاضر کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ ہمیں اس حوالے سے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہم اپنے دین پر عمل کرتے ہوئے دنیا کا نہ صرف مقابلہ کریں گے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دکھائیں گے لیکن آگے بڑھنے کے شوق میں محمد رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کا دامن ہاتھ سے ہرگز نہ چھوڑیں گے۔

حواشی

{۱} سورۃ توبہ میں بعض منافقین کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ نفاق نے ان کے دلوں میں اس طرح جڑیں پھیلا دی ہیں کہ وہ اب نکل ہی نہیں سکتا جب تک کہ دل کے ٹکڑے نہ کر دیئے جائیں۔ یہی صورت سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں ربا کی ہے۔

{۲} جوئے کے خاتمے کے سلسلہ میں حکمت قرآنی کا ایک عجیب رخ سامنے آتا ہے۔ جوا' جو ایک خالص معاشی معاملہ ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو خمر (شراب) کے ساتھ بریکٹ کر کے دونوں کی

حرمت و مذمت سورۂ بقرہ اور سورۂ مائدہ میں ایک ساتھ بیان کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جوئے میں بھی آدمی محنت سے جی چراتا ہے اور شراب کا نشہ بھی زندگی کے تلخ حقائق سے فرار کے لئے ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

میں میکدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا

شراب اور جوئے میں مشابہت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دونوں ہی بغض و عداوت پیدا کرنے کا موجب بھی ہیں۔

{۳} ان کا پہلا تجدیدی کارنامہ نامزدگی کی بنیاد پر خلیفہ بننے سے انکار اور لوگوں کو اپنی اس بیعت سے آزاد کرنا تھا جو نام ظاہر کئے بغیر ایک دستاویز پر لی گئی تھی جس میں بادشاہ نے اپنے بعد کے خلیفہ کا نام لکھ دیا تھا۔ اس بیعت سے آزاد کرنے کے بعد جب لوگوں نے خود اپنی آزاد مرضی سے ان سے بیعت کی تب آپ نے خلافت کی ذمہ داری قبول کی۔

{۴} اس موقعہ پر حضرت ابوبکرؓ کا یہ ارشاد پھر سے یاد کر لیجئے جو آپ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف اقدام کے موقعہ پر فرمایا تھا "اگر یہ لوگ کہیں کہ اونٹ تو لے جاؤ مگر اونٹ باندھنے کی رسی نہیں دیں گے تب بھی میں ان سے جنگ کروں گا"۔ کہاں اونٹ کہاں اونٹ کی رسی مگر اصل بات یہ ہے کہ آپ دین میں ذرا سی بھی ترمیم گوارا کرنے کے لئے تیار نہ تھے انہوں نے فرمایا تھا "کیا میرے جیتے جی دین میں کمی کی جائے گی؟"

{۵} ہمیں سیرت مبارکہ سے ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جب آپ نے مدد کے طالب کو کام کرنے کی ترغیب دی اور جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے اور ان سے معاش حاصل کرنے کا عملی راستہ بتایا۔

{۶} میں نے یہی بات ایک انٹرویو میں انگریزی جریدے ہیرالڈ کو کہی تھی' میرا انٹرویو توڑ مروڑ کر شائع کیا گیا۔ بعد میں اسی انٹرویو کا حوالہ ایک امریکن عورت نے اپنی کتاب میں بھی دیا ہے اور مجھ پر خوب فقرے چست کئے ہیں۔ میں نے جو اصل بات کہی تھی وہ ستر و حجاب کے احکام کے اثرات ہیں جو خاندانی نظام کے استحکام پر مرتب ہوتے ہیں۔

{۷} میں نے یہ بات صدر ضیاء الحق مرحوم سے بھی کہی تھی کہ یہ ایئر ہوسٹس جو ہفتوں کے لئے گھر سے باہر جاتی ہے یہ شریعت کے کون سے قاعدے کے مطابق جائز ہے جبکہ مسلمان عورت حج اور عمرے کے لئے بھی محرم کے بغیر نہیں جا سکتی۔ حالانکہ حج اور عمرہ کرنے والی خواتین بالعموم ادھیڑ یا عمر رسیدہ ہوتی ہیں مگر پی آئی اے میں اس کے برعکس نوجوان بچیاں کئی کئی دن کے لئے ایک سے دوسرے ملک فلائٹ کے ساتھ جاتی ہیں۔ غور کیجئے یہ کون ہیں' محمد رسول اللہ ﷺ اور حضرت عائشہؓ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی "بیٹیاں" ہیں!!۔

4

خطبہ رابع

نظام خلافت کے قیام

کا

نبوی طریق

ذیلی عنوانات

○ گزشتہ مباحث پر ایک نظر

○ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ دنیا کا مشکل ترین کام

○ نظام خلافت برپا کرنے کا لائحہ عمل

○ سیرت نبویؐ کے مطالعہ کی اہمیت

○ انقلاب محمدیؐ --- جامع انقلاب

○ منہج انقلاب نبویؐ کے مراحل

○ دعوت ایمان بذریعہ قرآن اور تربیت و تزکیہ

○ نظام جماعت کی بنیاد --- بیعت

○ تنظیم کا مرحلہ

○ اسلامی اجتماعیت کے تقاضے

○ درویشی کے چار عناصر

○ حق و باطل کا تصادم

○ دور حاضر میں تصادم کا مرحلہ

○ نبی ﷺ کے دور اور آج کے حالات میں فرق

○ نہی عن المنکر کے تین مدارج

○ نظام خلافت قائم کرنے کی جدوجہد عین فرض ہے

○ ہمارا کام

گزشتہ مباحث پر ایک نظر

گزشتہ تین خطبات میں ہم نے علمی اور معلوماتی موضوعات پر گفتگو کی ہے۔ مثلاً نظام خلافت کیا ہے۔ اس کے تحت ریاست کا دستوری اور سیاسی ڈھانچہ کیا ہوگا؟ اس ریاست میں اسلامی معاشرہ کی شکل کیا ہوگی، اقتصادی اور معاشی نظام کے وہ اصول و مبادی کیا ہیں جو اس نظام میں اختیار کیے جائیں گے؟ اب تک ان تمام موضوعات پر گفتگو کا انداز علمی رہا ہے۔[1]

خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ---- دنیا کا مشکل ترین کام

آج ہماری گفتگو کا موضوع علمی مباحث نہیں بلکہ یہ عملی مسئلہ ہے کہ نظامِ خلافت کیسے برپا ہوگا؟

اس ضمن میں میرا تاثر یہ ہے کہ یہ کام اتنا مشکل ہے کہ اگر نبی اکرم ﷺ نے اس نظام کے دوبارہ برپا ہونے کی صریح خبریں نہ دی ہوتیں[2] تو ہم کبھی یقین نہ کرتے کہ یہ کام دنیا میں ایک مرتبہ پھر ہو بھی سکتا ہے۔ میرا یہ تاثر اس لئے بنا ہے کہ پوری تاریخ میں یہ دورِ سعادت صرف ایک ہی بار دنیا نے دیکھا ہے۔ اس کام کے مشکل ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے اس کام کی تکمیل کسی بھی رسول کے ذریعہ نہ ہو سکی۔ اب رسالت و نبوت تو حضور اکرم ﷺ پر ختم ہو چکی ہے۔ تو ایک ایسا کام جو اس سے قبل رسولوں کے ذریعہ بھی نہ ہو سکا وہ اب امتیوں کے ہاتھوں کیسے ہو جائے گا۔ انسان کی محدود عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ جو کام تاریخ انسانی میں صرف ایک بار اور بھی سید الانبیاء والمرسلین کے ہاتھوں انجام پا سکا ہو وہ دوبارہ امتیوں کے ہاتھوں ہو جائے گا۔ پھر آج کے دور میں زمانے کا جو رخ ہے، انسان جس طرح

مادیت پرستی میں غرق ہے اور تمام دنیا کا مطلوب و مقصود بھی یہی کچھ قرار پاچکا ہے تو عقل آخر کیسے یہ تسلیم کر سکتی ہے کہ یہ کٹھن منزل بالآخر سر ہو جائے گی۔ پوری انسانیت پر مادہ پرست تہذیب کا غلبہ ہے۔ عالمی سطح پر اباحیت' عریانی اور فحاشی نے ایک آرٹ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اور "کلچر" کے نام سے اس کا فروغ ہو رہا ہے۔ یہ پوری دنیا کا رخ ہے جبکہ اسلام بالکل دوسرے رخ پر انسانیت کو لے جانا چاہتا ہے۔ اس لئے اس کام کو آسان سمجھ کر آگے بڑھنا اور کام کرنے کا بیڑا اٹھانا سخت نادانی ہے۔

اس کی ایک واقعاتی شہادت ہمارے پاس موجود ہے۔ پروپیگنڈے اور سیاسی دباؤ سے ہمارے دستور میں یہ دفعہ شامل تو ضرور کرائی گئی کہ "قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی"۔ مگر اس پر عمل آج تک نہیں ہو سکا قرار داد مقاصد منظور ہوئے تقریباً نصف صدی مکمل ہونے کو ہے۔ لیکن اس سے اگلا قدم آج تک نہیں اٹھایا جا سکا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ زمانے کا بہاؤ بالکل دوسرے رخ پر ہے جو اسلام کے عین مخالف سمت میں ہے۔ جاگیرداری کا خاتمہ کوئی آسان کام نہیں ہے یہ گویا شیر کے منہ سے نوالہ چھیننا ہے۔ وہ مراعات یافتہ طبقہ جس کی آج خدائی نافذ ہے۔ اس کی خدائی چھین لینا آسان کام نہیں ہے۔

میں یہ ساری باتیں آپ کو پست ہمت بنانے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ اس لئے کہہ رہا ہوں آپ سوچ سمجھ کر قدم بڑھائیں تاکہ بڑھنے والا کوئی قدم مشکلات کو دیکھ کر پیچھے نہ ہٹے۔ یاد رکھئے یہ مشکل ترین کام دوبارہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی خبر دی ہے محمد رسول اللہ ﷺ نے جو "الصادق والمصدوق" ہیں۔

نظام خلافت برپا کرنے کا لائحہ عمل

اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں اور نظام خلافت کو برپا کرنے کے لائحہ عمل کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہوں۔ لیکن اس بیان کے سلسلہ میں اپنے عمومی طریقے سے ہٹ کر میں اپنی بات کی وضاحت کے لئے نفی و اثبات کا اسلوب اختیار کروں گا۔ یہ بہت معروف اسلوب ہے۔ خود کلمہ طیبہ کے دو اجزاء ہیں پہلے جز کا تعلق نفی سے ہے یعنی

"الٰہ" اور دوسرے جز کا تعلق اثبات سے ہے۔ یعنی "الا اللہ"۔

میں پہلے چھ اعتبارات سے نفی کرنا چاہتا ہوں کہ پیش نظر کام اس طور سے نہیں انجام پا سکتا۔ اس طرح بہت سی باتیں خود بخود نکھر کر سامنے آجائیں گی۔ اسکے بعد اثبات کا معاملہ آسان ہو جائے گا۔ جن چھ باتوں کی میں نفی کرنا چاہتا ہوں ان کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ تین باتیں ایسی ہیں جن کو ہر مسلمان جانتا ہے۔ اس کے باوجود ان کو بھی شعور کی سطح پر تازہ کر لینا مفید ہے تاکہ انسان ان کے بارے میں بھی یکسو ہو جائے۔

خواہش، دعا اور غیر حکیمانہ محنت وہ تین باتیں ہیں جن سے یہ منزل سر نہیں ہو سکتی۔

خواہش، دعا اور غیر حکیمانہ محنت؟

(۱) خواہش: ظاہر بات ہے کہ یہ عظیم کام محض خواہش [۳] سے سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ سورۂ نساء آیت نمبر ۱۲۳ میں آتا ہے: ﴿لیس بامانیکم ولا امانی اهل الکتاب﴾ یعنی "اے مسلمانو نہ تمہاری خواہش سے کچھ ہو گا نہ اہل کتاب کی خواہش سے"۔ سیدھی سی بات ہے۔ محض خواہش سے گندم کا ایک دانہ بھی پیدا نہیں کیا جا سکتا اس کے لئے ہل چلا کر زمین تیار کرنی ہو گی اور مناسب وقت پر بیج ڈالنا ہو گا۔ اس کے بعد آپ کو اس کی آبیاری کرنا ہو گی۔ ورنہ آپ کو فصل نہیں ملے گی۔ اس لئے کہ یہ دنیا "عالم اسباب" کہلاتی ہے۔ ان اسباب و علل سے ہٹ کر کسی کام کا ہو جانا معجزہ ہے۔ اور معجزوں کا سلسلہ ختم نبوت ہی کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ [۴] معجزوں کا ظہور نبوت کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ بھی اتمام حجت کے لئے۔ حضور اکرم ﷺ کے اصل کار نبوت کی بنیاد معجزات پر نہیں بلکہ آپ نے اس کام میں مصائب و مشکلات کے پہاڑوں کا سامنا کیا ہے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ جب آپ ﷺ نے اور صحابہ ؓ نے اپنا سب کچھ لا کر قدموں میں ڈھیر کر دیا تو نصرت خداوندی آ گئی۔ اور یہ نصرت آج بھی آ سکتی ہے۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

(۲) دعا : دوسری بات یہ عرض کروں گا یہ کام محض دعا سے بھی نہیں ہو گا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ کہ دعا بہت بڑی شے بہت بڑی طاقت ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے "الدعاء مخ العبادہ" یعنی دعا عبادت کا مغز ہے۔ آپ کا ایک اور ارشاد گرامی ہے "الدعاء ھو العبادہ" یعنی دعا ہی عبادت ہے۔ آپ نے دعا کی طاقت و قوت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے "لایرد القضاء الا الدعا" گویا تقدیر معلق (قضائے غیر مبرم) بھی دعا سے بدل جاتی ہے۔ دعا کی یہ اہمیت مسلم ہے لیکن دعا کے ضمن میں بھی اللہ تعالی کے کچھ قوانین ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ دعا کرنے والا دعا کا منہ بھی رکھتا ہے کہ نہیں۔ قرآن حکیم میں آتا ہے : "یا اھل الکتب لستم علی شیء حتی تقیموا التوراۃ والانجیل ﴾ اے کتاب والو! تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے (تمہارا منہ نہیں ہے ہم سے بات کرنے کا) جب تک تم تورات اور انجیل کو قائم نہیں کرتے۔ اسی پر آپ اپنے بارے میں قیاس کر لیجئے کہ "یا اھل القرآن...... یعنی اے اہل قرآن تمہاری کوئی حیثیت نہیں جب تک تم قرآن کو قائم نہ کرو"۔

دوسری بات یہ ہے کہ دعا تب قبول ہوتی ہے کہ جب انسان کے بس میں جو کچھ ہو وہ کر چکا ہو۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ میدان میں لا کر ڈال دو اس کے بعد اللہ سے دعا مانگو بقول اقبال ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

نصرت خداوندی کا سلسلہ بند ہرگز نہیں ہوا ہے۔ لیکن اس نصرت کے حصول کا ایک قاعدہ ہے جو سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۲۱۴ میں بیان ہوا ہے۔

﴿ ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم الباساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین امنوا معہ متی نصر اللہ "الا ان نصر اللہ قریب ﴾

"کیا تم نے سمجھا ہے کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تو تم پر وہ

> حالات آئے ہی نہیں ہیں جو تم سے پہلے والے لوگوں پر آ چکے ہیں۔ ان پر تکالیف آئیں فقر و فاقے سے دوچار ہوتا پڑا اور انہیں ہلا مارا گیا یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ (تب انہیں یہ خوشخبری سنائی گئی) سنو اللہ کی مدد (بس) قریب ہے"۔

چنانچہ میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مسلمانوں کو جو یہ خبریں دی گئیں ہیں کہ "نصر من اللہ وفتح قریب" اور یہ کہ "اللہ نے ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والوں سے استخلاف کا وعدہ کیا ہے"۔ تو یہ خبریں سن ۵ھ کے آخر یا سن ۶ھ کے اوائل میں دی گئیں تھیں۔ مکی دور کے تیرہ برس اور غزوہ احزاب (خندق) تک کے ۵ برس انتہائی کٹھن مصائب کا دور ہے۔ ان سترہ برسوں میں گویا نبی اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے جہد و قتال سے اپنے ایمان اور عمل صالح کا ثبوت فراہم کر دیا تھا۔ اس کے بعد فرمایا گیا اے نبی! بشارت دے دیجئے کہ آپ اور آپ کے ساتھی ہمارے امتحانات میں کامیاب ہو گئے ہیں اب ہماری مدد آیا چاہتی ہے اور فتح تمہارے قدم چوما چاہتی ہے۔

میں نے یہ جو عرض کیا ہے کہ محض دعاؤں سے یہ کام نہیں ہو گا۔ تو اس کا تجربہ خود آپ بھی کر چکے ہیں۔ سن ۷۱ء کی جنگ میں بھارت کے خلاف ہماری دعاؤں کا کیا حشر ہوا۔ بہت سی مساجد میں قنوت نازلہ [۵] کا اہتمام کیا گیا۔ کتنی ہی مجلسیں تھیں جن میں یہ موثر دعا بڑی الحاح و زاری کے ساتھ پڑھی گئی۔ مگر نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ اس سے معلوم ہوا کہ دعا کے بھی کچھ قواعد و ضوابط ہیں۔ پروردگار عالم یہ بھی دیکھتا ہے کہ مانگنے والا کون ہے؟ ہمارے دین اور ہماری شریعت کے بارے میں اس کا رویہ کیا ہے۔ اس کا ذاتی کردار کیا ہے۔ لہٰذا دعاؤں میں بھی اثر جب ہو گا جب ہم اپنے عمل سے ثابت کر دیں گے کہ ہم دعا کے اہل ہیں [۶]۔

(۳) **غیر حکیمانہ محنت و مشقت** : اب میں تیسری بات عرض کر رہا ہوں جو کہ بہت ہی اہم ہے۔ اور وہ یہ بات ہے کہ یہ کام محض محنت و مشقت سے بھی نہیں ہو گا۔ چاہے یہ محنت و مشقت اپنے آخری درجے کو پہنچی ہوئی ہی کیوں نہ ہو۔ ہماری یہ محنت و

مشقت تب ثمر آور ہو گی جب یہ محنت طریق محمد ﷺ کے مطابق ہو۔ مجرد قربانیاں دیتے چلے جانے سے نہ پہلے کچھ ہوا نہ اب کچھ ہو گا۔ آپ کے سامنے کی بات ہے۔ افغانستان میں دس لاکھ جانیں اخلاص و خلوص کے ساتھ دی گئیں لیکن نتیجہ کیا ہے باہم دست و گریباں ہیں اس لئے کہ جدوجہد طریق نبوی" سے ہٹ کر کی گئی۔ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ ہے کہ وہاں جو خون خلوص کے ساتھ دیا گیا ہے وہ اللہ کے حضور ضائع نہیں جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی کوئی نتیجہ نکالیں گے۔ لیکن ابھی تک نہیں نکلا۔ جو چیز ہمیں نظر آ رہی ہے وہ تو خانہ جنگی ہے۔ اسی طرح تحریک پاکستان کے دوران لاکھوں جانوں کی قربانی دی گئی لیکن یہاں اسلام تو پھر بھی نہیں آیا۔ یہ مثالیں ہماری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہیں۔ بقول شیخ سعدیؒ

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

دو بزرگ شخصیتوں کے حوالے سے یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری قربانیاں طریق محمدیؐ پر چل کر ہی رنگ لا سکتی ہیں۔ ان دو بزرگوں میں سے ایک انبیاء کے بعد افضل البشر بالتحقیق حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور دوسری شخصیت امام دارالہجرت امام مالک رحمہ اللہ کی ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین نامزد کیا تو اس موقعہ پر آپ نے ایک بہت پیارا خطبہ ارشاد فرمایا اس خطبے میں آپ نے فرمایا: "لا یصلح آخرہ الا بما صلح بہ اولہ" یعنی ایک بات اچھی طرح جان لو کہ اس معاملے (نظام خلافت) کے آخری حصہ کی اصلاح نہیں ہو گی مگر اسی طور سے جس طور سے پہلے حصہ کی اصلاح ہوئی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اس قول کو مزید واضح کر کے امام مالکؒ نے بیان کیا کہ "لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولہ" یعنی اس امت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہو گی مگر صرف اس طور سے جس طور سے کہ پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی۔ اس بات کو اپنے قلب و دماغ میں کندہ کر لینا چاہئے کہ دوسروں سے مستعار لئے گئے طریقوں سے نتیجہ برآمد نہیں ہو گا۔ اور اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ طریق محمدی ﷺ کے کسی ایک جز پر

عمل کر کے بھی منزل سر ہو گی۔ ہمیں سیرت محمدیؐ میں دیکھنا ہوگا کہ کیا چیز پہلے تھی اور کیا بعد میں اور یہ کہ سیرت کا مطالعہ ایک کل کی حیثیت سے ہونا چاہئے۔ میں نے یہ بات اس مفصل حدیث مبارکہ کے حوالے سے آپ کے سامنے رکھی تھی کہ اس امت کا پہلا حصہ بھی خلافت علیٰ منہاج النبوہ پر ہے اور آخری حصہ بھی خلافت علیٰ منہاج النبوہ پر ہو گا۔ اب اس حدیث کو سامنے رکھ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت امام مالکؒ کے اقوال پر تدبر کیجئے۔ فرمایا کہ اس امت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہو سکے گی مگر اسی طور سے کہ جس طور سے پہلے حصہ کی اصلاح ہوئی اس سے ظاہر ہوا کہ جس طریق کار سے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام اس وقت قائم ہوا تھا اسی طریق پر چلیں گے تو وہ نظام دوبارہ قائم ہو گا ورنہ نہیں ہو گا۔

عملی تجربے کی شہادت

میں نے جو باتیں نفیاً بیان کی ہیں کہ ان سے خلافت علیٰ منہاج النبوہ قائم نہیں ہو سکتی اب میں ان کا جائزہ Applied Form میں بھی پیش کرنا چاہتا ہوں اور اس جائزے میں توجہ کا ارتکاز سیرت نبوی ﷺ پر رہے گا۔ میری یہ گفتگو اصولی ہو گی کسی خاص جماعت یا گروہ کا ذکر کئے بغیر میں چند باتیں عرض کروں گا۔ اس ضمن میں پہلی بات جس کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کا یہ جو خیال ہے کہ بس تبلیغ اور تلقین کئے چلے جاؤ۔ جب سب لوگ بدل جائیں گے تو نظام خود بخود بدل جائے گا حالانکہ دعوت و تبلیغ طریق محمدی ﷺ کا محض نقطہ آغاز ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ محض تبلیغ سے یہ کام ہو جائے گا تو وہ بہت بڑے مغالطے میں ہے۔ دعوت و تبلیغ سے افراد میں تبدیلی آ جاتی ہے مگر نظام نہیں تبدیل ہوا کرتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلیم الفطرت لوگ دعوت حق کی طرف کھنچ آتے ہیں۔ جس طرح مقناطیس لوہ چون کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اسی طرح ہمارا دین جو دین فطرت ہے وہ بھی سلیم الفطرت انسانوں کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے اور وہ اس کی دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن نظام کا معاملہ الگ ہے اس کے ساتھ تو اصحاب اقتدار لوگوں کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ نظام

سے خصوصی مراعات حاصل کر رہے ہوتے ہیں اس لئے بگڑے ہوئے لوگ محض دعوت سے ماننے والے نہیں۔ ان کو منوانے کے لئے کچھ اور کرنا پڑے گا۔ سورۃ حدید میں یہی بات تو کہی گئی ہے کہ۔

> ﴿لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتٰب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ باس شدید و منافع للناس ولیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب ان اللہ قوی عزیز﴾
>
> ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی واضح تعلیمات اور معجزات کے ساتھ اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں اور (ہاں) ہم نے لوہا اتارا جس کے اندر جنگ کی قوت ہے اور لوگوں کے لئے دیگر فائدے بھی ہیں تاکہ اللہ پرکھ لے کہ لوہے کی طاقت سے (کون ہے جو غیب میں ہوتے ہوئے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے بے شک اللہ قوی غالب ہے۔

اس آیت مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ انصاف پر لوگوں کو قائم کرنا، دین غالب کرنا گویا اللہ کی مدد کرنا ہے علاوہ ازیں دین کے غالب نہ ہونے کا سبب اللہ کے خلاف بغاوت ہے۔ اور اس بغاوت کو فرو کر کے اللہ کے دین کو قائم کرنا اللہ کی مدد ہے اور چونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرض منصبی اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے لہٰذا یہ رسول کی مدد بھی ہے۔ اسی لئے رسول کی دعوت ہوتی ہے: "من انصاری الی اللہ" (کون ہے میرا مددگار اللہ کے دین کے غلبے کے لئے)

سورۃ حدید کی مذکورہ بالا آیت قرآن حکیم کی اہم ترین آیات میں سے ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ نظام بدلنے کے لئے طاقت کا استعمال ناگزیر ہے" یہاں تک کہ کسی مرحلے پر اسے بھی استعمال کرنا پڑے گا۔

اس سلسلہ میں ایک نہایت اہم بات عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص محض دعوت و تبلیغ سے نظام خلافت برپا کرنے کا خیال، اس خیال نے حقیقی مشکلات کو پیچھے اور جائے بغیر رکاوٹ کے تو اس سے دل کو بہلایا جا سکتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا

تصور غیر شعوری طور پر ہی سہی نبی اکرم ﷺ کی توہین (نعوذ باللہ) کو متضمن ہے۔ کیونکہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ یہ کام محض دعوت و تبلیغ سے اگر ممکن ہوتا تو پھر حضور ﷺ نے تلوار ہاتھ میں کیوں لی؟ میں تو کہتا ہوں کہ اگر محض دعوت و تبلیغ سے یہ کام ممکن ہو سکتا تو نبی اکرم ﷺ کسی مسلمان کے خون کا ایک قطرہ تو دور کی بات ہے کسی کافر کے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرنے دیتے۔ لیکن نظام بدلنے ہی کے لئے رحمۃ للعالمین کو یہ کام کرنا پڑا۔ اگر ایک طرف سینکڑوں کفار کا خون بہایا گیا تو دوسری طرف سینکڑوں صحابہ کو بھی اپنی جانوں کی قربانی پیش کرنی پڑی [۸] خود نبی اکرم ﷺ کا خون دامن احد میں جذب ہوا اور طائف کی گلیوں میں بھی بکھرا۔

انتخابات کا راستہ

دعوت و تبلیغ کے علاوہ پوری دنیا میں جو دوسرا "پاپولر" طریقہ رائج ہے وہ الیکشن کا طریقہ ہے اور جس شے کا چلن ہو جاتا ہے اسی میں لوگوں کو سو خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ الیکشن بھی ان طریقوں میں سے ہے جو ہم کو استادان مغرب نے سکھائے ہیں۔ اقبال نے ان پر پھبتی کستے ہوئے کہا ہے۔

الیکشن ممبری کونسل صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

جیسا کہ میں نے عرض کیا ایک چیز کا جب چلن ہو جاتا ہے تو وہ ذہنوں پر اپنا پورا تسلط جما لیتی ہے۔ اس وقت نہ معلوم کتنی جماعتیں اور کارکنان انتہائی اخلاص کے ساتھ اپنی توانائیاں اس طریق کار کے تحت کھپا رہے ہیں۔ یہ بات میں پورے خلوص دل سے کہہ رہا ہوں کہ جتنی جماعتیں بھی اس طریق کار کو اپنائے ہوئے ہیں ان کے کارکنان کے اخلاص میں مجھے ذرہ برابر شک نہیں ہے۔ ہر جماعت کے پیچھے چلنے والوں کی اکثریت مخلص ہی ہوا کرتی ہے اور ان ہی مخلص کارکنوں کے دم سے ان جماعتوں کا وجود قائم ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ لیڈروں میں سے کسی کا معاملہ مختلف ہو لیکن ان میں سے بھی کسی کے بارے میں ہم یقین

کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ نیت کا حال تو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

ان تمام بزرگوں اور کارکنوں کے اخلاص کو تسلیم کرتے ہوئے میں یہ ضرور کہوں گا کہ ان کا یہ خیال کہ انتخابات کے راستے سے نظام بدلا جا سکے گا بہت بڑی نادانی ہے۔ اس ضمن میں میں ایک آخری درجے کی مثال بیان کر رہا ہوں کہ اگر نبی اکرم ﷺ انتخابات کے ذریعہ جزیرہ نمائے عرب میں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے تو کیا ایسا کر سکتے تھے؟ یہ بات میں نے ڈرتے ڈرتے کہی ہے کہ اس کو آنحضرتؐ کی شان میں گستاخی نہ قرار دے دیا جائے۔ لیکن ایک اور مثال ماضی قریب سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیا ایران میں آیت اللہ خمینی صاحب کی حکومت انتخابات کے ذریعہ قائم ہو سکتی تھی؟ کوئی ایک شخص بھی اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔ پھر اگر اس ضمن میں آپ کو قرآن کی نص مطلوب ہے تو وہ یہ ہے کہ قرآن حکیم سورۃ انعام کی آیت نمبر ۱۱۶ میں کہتا ہے

﴿وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ﴾

"اگر تم زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا کر چھوڑیں گے"۔

جبکہ الیکشن کا سارا دارومدار اکثریت اور اقلیت پر ہے۔ پورا نظام ہی اس مفروضے پر چل رہا ہے کہ اکثریت حق پر اور اقلیت باطل پر۔

اب نص قرآنی کے بعد اگر عقلی دلیل مطلوب ہے تو وہ بھی موجود ہے۔ یہ بات ہر آدمی جانتا ہے کہ ہر ملک ایک مخصوص politico-socio-economic ڈھانچے پر قائم ہوتا ہے۔ بعض ممالک میں جاگیردارانہ نظام ہے تو بعض میں سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہیں۔ کہیں آپ دیکھیں گے کہ قبائلی نظام رائج ہے۔ اس نظام کے تحت قبائلی سرداری طاقت کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ آپ اس نظام میں رہتے ہوئے انتہائی عمدہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کا انتظام کر لیجئے' اس الیکشن میں بھی وہی Politico-socio-economic Structure ہی نمایاں ہو کر سامنے آئے گا جو اس معاشرے میں رائج ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ پاکستان میں ۷۰ فی صد آبادی دیہات پر مشتمل ہے۔ اور یہ سب جاگیرداروں اور وڈیروں کے مزارعین ہیں۔ ان

حالات میں آپ تبدیلی کیسے لائیں گے۔ اس نظام کے اندر انتخابات سے یہ تو ہو جائے گا کہ ایک لغاری کی جگہ دوسرا لغاری آ جائے۔ اسی طرح ایک مزاری کی بجائے دوسرا مزاری اور ایک جتوئی کی جگہ دوسرا جتوئی منتخب ہو جائے۔ لیکن ان کو ہٹا کر کوئی اور نہیں آئے گا۔ شہروں میں ممکن ہے کہ کوئی تبدیلی آ جائے اس لئے کہ شہروں میں جاگیرداروں کا قبضہ دیہاتوں جیسا نہیں ہے۔ شہروں میں کوئی عوامی تحریک چل سکتی ہے۔ جیسا کہ ایم کیو ایم کی تحریک کراچی میں چلی ہے۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ شہروں کی کوئی تبدیلی اس ملک کے اندر بحیثیت مجموعی فیصلہ کن نہیں ہو سکتی اگر اس تبدیلی کی اساس انتخابات ہوں۔

ان تمام دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے اگر تھوڑی دیر کے لئے انسان سوچے تو اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ انتخابی طریق کار ہرگز کارگر نہیں ہو سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان تمام دلائل کے باوجود چونکہ انتخابی سیاست گھٹی میں پڑ گئی ہے اس لئے اس سے جان کیسے چھڑائی جا سکتی ہے؟! انتخابی سیاست کو نہ چھوڑنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کچھ لوگوں کو کچھ حصے مل جاتے ہیں۔ انہیں قومی اسمبلی، سینٹ یا صوبائی اسمبلیوں میں نشست مل جاتی ہے۔ ان چند سیٹوں کے لئے اپنے وسائل اور کارکنان کی صلاحیتوں کو قربان کیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں پہلا الیکشن ۵۱ء میں پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے لئے ہوا تھا۔ اور اب ۱۹۹۴ء ہے' آپ اندازہ لگائیں ۴۳ سال بیت گئے ہیں۔ تقریباً نصف صدی کے ان ناکام تجربوں کے بعد بھی عقل نہ آئے تو اسے کیا کہا جائے؟ قرآن حکیم کہتا ہے ﴿حتی اذا بلغ اشدہ وبلغ اربعین سنۃ﴾ یعنی بچہ بھی چالیس برس کی عمر کو شعوری اعتبار سے پختہ ہو جاتا ہے۔ کاش ہماری دینی جماعتوں کو بھی کوئی سبق حاصل ہو جائے اور وہ اپنے اختیار کردہ راستے پر نظرثانی کے لئے تیار ہو جائیں۔

تشدد اور دہشت گردی

ایک اور خطرناک راستہ بھی بعض دینی تحریکوں نے دنیا کی دیکھا دیکھی اپنا لیا ہے۔ اور وہ ہے چھاپہ مار کارروائیاں اور مخالفین یا معاندین کے خلاف تشدد اور دہشت گردی کے حربے۔ اگرچہ یہ کارروائیاں اسلامی تحریکوں نے تشدد کے جواب میں اختیار کی ہیں

اوران کے جواز کے لئے حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں "قتال" کے مرحلے سے بھی استدلال کیا گیا ہے' لیکن اس طرح کی کارروائیوں سے بھی نظام خلافت کا قیام ممکن نہیں ہے۔[۹]

بد قسمتی سے یہ معاملہ خاص طور پر عرب ممالک میں شدید ہو رہا ہے۔ مجھے ۱۹۷۹ء میں کچھ وقت مصر کے مختلف شہروں میں گزارنے کا موقع ملا۔ میں نے وہاں دیکھا کہ نہایت دیندار نوجوان ان کارروائیوں میں ملوث تھے۔ میں ان کی دینداری کو اس طرح بیان کرتا ہوں ایک فکری' انقلابی اور نظریاتی مزاج جماعت اسلامی نے پیدا کیا ہے۔ اور تدین' اتباع سنت اور عجز وانکساری کا حامل دوسرا مزاج تبلیغی جماعت نے پیدا کیا ہے۔ ان مصری نوجوانوں میں یہ دونوں مزاج جمع تھے۔ لیکن انہی نوجوانوں نے وہاں تشدد کے جواب میں دہشت گردی کا راستہ اختیار کرلیا۔

اسی طرح دیکھئے الجزائر کی اسلامی تحریک الیکشن کا راستہ اختیار کئے ہوئے تھی اور الیکشن میں اس کی کامیابی یقینی ہو چکی تھی۔ پہلے مرحلے کے نتائج میں اس تحریک کو نمایاں برتری حاصل تھی[۱۰] لیکن الیکشن میں اس کامیابی کے بعد ان کا راستہ تشدد سے روکا گیا۔ انتخابات منسوخ کر دیئے گئے۔ اور تحریک اسلامی کے کارکنوں کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اسلامی تحریک نے بھی جوابی تشدد کا راستہ اختیار کرلیا[۱۱] اس طرح کی کارروائیاں قومی فوج اور ملکی حکمرانوں کے خلاف کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتیں۔ اس قسم کی کارروائیاں قابض افواج (Occupation armies) اور غیر ملکی حکومت کے خلاف مفید اور موثر ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ خود الجزائر میں بھی فرانسیسی استعمار کے خلاف طویل مسلح جدوجہد جاری رہی اور بالآخر فرانس الجزائر سے جانے پر مجبور ہو گیا[۱۲] جبکہ قومی فوج کے خلاف اس طرح کی پر تشدد تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی ان دونوں کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ (اول تو) الجزائر کے معاملے میں قابض فوج کی suply line یعنی فرانس بہت دور واقع تھا۔ فوج کا دارومدار وہاں سے اسلحہ وغیرہ کی فراہمی پر تھا۔ ویت نام میں امریکہ جیسی سپر طاقت بھی اسی وجہ سے ہار کھا گئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ قومی فوج اور ملکی حکومت کے رابطے ملک میں بسنے والی

آبادی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان کے خلاف پرتشدد کارروائی سے بالعموم ان کے ساتھ قوم کی ہمدردی اور تعاون میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور تشدد کی راہ اپنانے والی تحریک کی مخالفت بڑھتی چلی جاتی ہے۔

سیرۃ نبویؐ کے مطالعہ کی اہمیت

نبی اکرم ﷺ کے طریق کار کو میں نے "انقلابی جدوجہد" کا عنوان دیا ہے، اور اس جدوجہد کے تمام مراحل کو سیرۃ النبیؐ کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ میں نظام بدلنے کے عمل کو "انقلاب" کا نام دیتا ہوں اور اس انقلابی عمل کا واحد ذریعہ سیرۃ النبیؐ ہے۔ یہ بات آپ کو معلوم ہے کہ اگر ذرا سا بھی گمان ہو جائے کہ اس زمین میں تیل کا خزانہ چھپا ہوا ہے تو محض اس گمان کی بنیاد پر وہاں سے تیل نکالنے کے لئے کروڑوں روپے بے دریغ خرچ کر ڈالے جاتے ہیں۔ اور اگر کہیں یہ یقین ہو جائے کہ اس سرزمین میں تیل یقینی طور پر موجود ہے تو پھر کیا کہنے! جب ہم کو معلوم ہے کہ انقلابی جدوجہد کے مراحل اور مدارج کا علم ہم کو سیرۃ النبیؐ سے حاصل ہو سکتا ہے بلکہ سیرت اس علم کا واحد ذریعہ ہے تو ہماری پوری توجہ اسی پر مرکوز ہونی چاہیے کہ "جا ایں جا است"۔ پھر جب ہم اس یقین کے ساتھ سیرۃ النبیؐ کا مطالعہ کریں گے تو بین السطور جو کچھ ہے اس پر بھی غور کرنا ہو گا۔ سیرۃ النبیؐ ہی سے ہم سمجھ سکیں گے کہ آپؐ نے پہلے مرحلے میں کیا کام انجام دیئے اور دوسرے مرحلے میں کیا انجام دیئے۔ اور وہ کون سے شرائط تھیں جن کی تکمیل کے بعد آپ نے اگلے مرحلے میں قدم رکھا۔

"انقلاب محمدیؐ"---- جامع انقلاب

انقلابی جدوجہد کے مراحل و مدارج کا ادراک فقط سیرۃ النبیؐ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میں اپنے اس دعوے کو دو حوالوں سے واضح اور مبرہن کرنا چاہتا ہوں۔ اس دعوے کی پہلی دلیل یہ ہے کہ دنیا میں دوسرے جتنے بھی انقلاب آئے ہیں وہ سب جزوی تھے۔ پوری انسانی تاریخ میں ہر اعتبار سے کامل انقلاب کی واحد مثال "انقلاب محمدیؐ" ہے۔

سوا دو سو سال قبل برپا ہونے والے "انقلاب فرانس" کا بہت چرچا ہے۔ لیکن اس انقلاب سے صرف سیاسی ڈھانچہ تبدیل ہوا تھا۔ اسکے نتیجے میں نہ عقائد بدلے' نہ اخلاق بدلے' نہ معاشرت بدلی حتی کہ معاشی ڈھانچہ بھی بڑی حد تک جوں کا توں رہا۔ گویا اجتماعی زندگی کا صرف ایک پہلو تبدیل ہوا۔

اسی طرح اس صدی کے آغاز میں بالشویک (سوشلسٹ) انقلاب سے صرف معاشی ڈھانچہ تبدیل ہوا۔ اور نئے معاشی ڈھانچہ کی بنیاد نجی ملکیت (Private ownership) کو ختم کر کے تمام وسائل دولت کو قومیانے (Nationalize) کرنے پر رکھی گئی۔ مگر اس معاشی ڈھانچے کی تبدیلی سے عقائد' اخلاق' اقدار اور تہذیبی روایات اور انداز فکر و نظر میں جس انقلابی تبدیلی کے وعدے کئے گئے تھے وہ سب باطل ثابت ہوئے۔

ان دونوں انقلابات کے برعکس اگر نبی اکرم ﷺ کے برپا کردہ انقلاب کو دیکھا جائے تو ہمیں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو خوردبین کے نیچے رکھ کر تلاش کرنا پڑے گا کہ اس میں سے کونسی شے تبدیل ہونے سے بچ گئی۔ لوگوں کے عقائد بدل گئے' نظریات بدل گئے' اقدار بدل گئیں' غرض زندگی کے شب و روز اور صبح و شام تک بدل گئے۔ معاشی اور سیاسی ڈھانچہ ہی نہیں تبدیل ہوا بلکہ ایک ایسی قوم جس کے سب سے متمدن قبیلے میں لکھنا پڑھنا جاننے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے وہ علم و تحقیق میں بھی دنیا کی امام بن گئی اور قدیم علوم کے احیاء کے علاوہ بہت سے جدید علوم و فنون کی موجد قرار پائی۔ وہ جھگڑالو قوم جس کو قرآن حکیم نے "قوماً لُدًّا" کہا ہے اور مولانا حالی نے جس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ؎

کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا

وہ دنیا کی مہذب ترین قوم بن گئی اور ایسی امن پسند قوم بن گئی کہ حضور اکرم ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق ایک عورت صنعاء سے حضرموت تک سفر کرتی اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوتا' عورتیں ان راہوں پر سفر کرنے لگیں جہاں بدرقوں کے بغیر بڑے بڑے

قانون کا نکل جانا آسان نہ تھا۔ جو قوم نظم سے قطعاً نا آشنا تھی اور جس کا ہر فرد فرعون بے سامان بنا ہوا تھا وہ نظم کی ایسی خوگر ہو گئی کہ ان کی پنج وقتہ عبادت بھی اذان، اقامت، صف بندی اور امام کے "cautions" کی ایسی پابند ہو گئی کہ اس پر فوجی ڈرل کا گمان ہونے لگا۔ یہ ہے وہ انقلاب عظیم جو محمد رسول اللہ ﷺ نے برپا کیا تھا۔

انقلاب محمد ﷺ اور دوسرے انقلابات میں ایک اور فرق بھی موجود ہے کہ دوسرے جتنے بھی انقلاب برپا ہوئے وہ کئی نسلوں (generations) میں جا کر مکمل ہوئے۔ ایک نسل نے صرف فکر دیا۔ گویا اس نسل میں مفکرین پیدا ہوئے۔ یہ مرد میدان تو تھے نہیں کہ کسی انقلابی جدوجہد کا آغاز کر کے اسے کامیاب بناتے۔ تاریخ میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً والٹیر اور روسو بہت بڑے مفکر اور مصنف ضرور ہیں چنانچہ انقلاب فرانس کی پشت پر ونہی کا فکر کارفرما تھا۔ لیکن انقلاب کا عملی قائد تو روسو نہ تھا۔ بلکہ انقلاب فرانس کا تو سرے سے کوئی قائد ہی نہ تھا اور اسی لئے یہ ایک بڑا خونی انقلاب ثابت ہوا۔

دوسرا انقلاب جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ "بالشویک انقلاب" تو اس کی پشت پر کارل مارکس اور اینجلز کے افکار موجود تھے۔ کارل مارکس نے "Das Capital" (داس کیپیٹل) جیسی یادگار کتاب لکھی۔ علامہ اقبال نے اس کے اور اس کی کتاب کے بارے میں کہا تھا "نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب (پیغمبر تو نہیں ہے مگر اپنی بغل میں کتاب رکھتا ہے) اس میں کوئی شک نہیں کہ مارکس نے فکر دیا، لیکن وہ خود اپنی زندگی میں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب برپا نہ کر سکا اس نے اپنی کتاب جرمنی اور انگلستان میں مکمل کی (اور اس کے فلسفے کے مطابق انقلاب بھی انہی مکمل صنعتی اور سرمایہ دار ممالک میں آنا تھا) جبکہ انقلاب آیا روس جیسے صنعتی لحاظ سے پس ماندہ زرعی معیشت رکھنے والے ملک میں!

اس کے مقابلے دیکھئے انقلاب محمدی ﷺ میں تمام مراحل اور مدارج فرد واحد کی اپنی زندگی ہی میں تکمیل پذیر ہو گئے۔ آپ ﷺ تن تنہا دعوت کا آغاز کر رہے ہیں۔ نہ آپ کے پاس کوئی جماعت ہے نہ کوئی ادارہ ہے، نہ پہلے سے بنی ہوئی کوئی امت ہے۔

آغازِ دعوت میں آپ کی زوجہ محترمہ، آپ کے جگری دوست، آپ کے آزاد کردہ ایک غلام اور آپ کے چچازاد کم عمر بھائی[۱۳] ایمان لائے۔ دس سال کی محنت شاقہ سے بمشکل سوا سو یا ڈیڑھ سو لوگ ایمان لائے۔ پھر وہی فردِ واحد کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر "واصباحاہ"[۱۴] کا نعرہ بھی لگاتا ہے۔ اور آپ دیکھیں کہ ایک مرحلے میں وہی شخص ﷺ میدان بدر میں فوج کی قیادت بھی فرما رہے ہیں۔ یہاں تک کہ انقلاب کی تکمیل تک اکیلا وہی شخص ﷺ تمام مراحل میں قیادت کے تمام تقاضے پورے کرتا رہا۔ یہ بات آپ کو پوری انسانی تاریخ میں اور کہیں نہیں ملے گی۔ اس اعتبار سے بھی ہم کو یقین کر لینا چاہیے کہ اس انقلابی عمل کا واحد ذریعہ اور ماخذ سیرۃ محمدیؐ ہے۔

منہج انقلاب نبوی ﷺ کے مراحل

اب میں سیرۃ النبی ﷺ سے اخذ کردہ مراحل انقلاب کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے مختلف مواقع پر میں منہج انقلاب نبوی کو چھ مراحل میں تقسیم کر کے پیش کرتا رہا ہوں۔ یعنی (۱) دعوت (۲) تنظیم (۳) تربیت (۴) صبر محض یا (Passive Resistance) (۵) اقدام یا (Active Resistance) اور بالآخر (۶) مسلح تصادم یا (Armed Conflict) آج میں ان مراحل کو سادہ زبان میں مختصر کرتے ہوئے تین مراحل میں بیان کروں گا۔

دعوت ایمان بذریعہ قرآن اور تربیت و تزکیہ

پہلا مرحلہ "دعوت ایمان بذریعہ قرآن" ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہر کام کی کوئی فلسفیانہ بنیاد ہوتی ہے۔ جب تک یہ فلسفہ ذہن میں نہ بیٹھ جائے اس انقلاب کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اسلام کی نظریاتی اور فلسفیانہ بنیاد "ایمان" ہے[۱۵] مگر ہماری عظیم اکثریت کا حال یہ ہے کہ ہم ایمان سے محروم ہیں۔ ہم اس لئے مسلمان ہیں کہ مسلمان والدین کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔ بس ایک موروثی عقیدہ ہے جو ہمارے ذہن

کے کسی گوشے میں موجود ہے۔ اس عقیدے کا ہمارے فکر و عمل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہماری وہ اقدار جن سے ہم اپنا طرزِ عمل متعین کرتے ہیں ہمارے عقیدے کا ان اقدار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ اس کیفیت سے بچے ہوئے بہت کم لوگ ہیں۔ ہم سے بیشتر لوگوں کا حال یہی ہے کہ ہم بس مسلمان ہیں۔ اور اس کو بھی اللہ کا بڑا فضل ہی سمجھنا چاہئے کہ اس نے ہم کو مسلمانوں کے گھر میں پیدا کیا ورنہ خدانخواستہ اگر ہماری پیدائش کسی ہندو یا عیسائی کے گھر میں ہوتی تو ہم میں سے کتنے لوگ ایمان قبول کر لیتے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنا جائزہ خود لے سکتا ہے۔

سورۃ حجرات کی آیت (نمبر ۱۵) میں ایمان کو define کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے

﴿انما المومنون الذین امنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا
وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ ' اولئک ھم
الصادقون O﴾

"مومن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر پھر شک میں نہ پڑے اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مال کے ساتھ جہاد کیا۔ یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں"۔

اس آیت کریمہ میں حقیقی ایمان کا ذکر ہے۔ یعنی وہ ایمان جو یقین کے درجے کو پہنچ چکا ہو۔ بقول اقبال ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں' یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

سورۃ حجرات کی مذکورہ بالا آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان و جہاد لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ دل میں حقیقی ایمان موجود ہو اور عمل میں جہاد نہ ہو۔ لہٰذا اس انقلابی عمل کا پہلا مرحلہ "دعوت ایمان بذریعہ قرآن" ہے۔ اسی لئے سورۃ نساء آیت ۱۳۶ میں فرمایا گیا ہے:

﴿یایھا الذین امنوا امنوا باللہ ورسولہ والکتب الذی نزل
علی رسولہ والکتب الذی انزل من قبل﴾

"اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اس نے نازل کی"۔

اس آیہ مبارکہ میں گویا یہ کہا گیا ہے کہ قانونی ایمان تو تم کو پہلے ہی حاصل ہے، لیکن حقیقی ایمان جو بہت بڑی قوت ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

اس موقع پر ایک بات اور یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن کے علاوہ بھی حصول ایمان کے کچھ راستے ہیں۔ میں خود تسلیم کرتا ہوں کہ حصول ایمان کا سب سے آسان ذریعہ اصحاب ایمان و یقین کی صحبت اختیار کرنا ہے۔ قرآن مجید میں بھی فرمایا گیا:

﴿یا ایها الذین امنوا اتقوا الله وکونوا مع الصادقین ۝﴾

[التوبہ : ۱۱۹]

"اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کی معیت اختیار کرو"۔

ظاہر ہے کہ کہیں آگ جل رہی ہو تو اس کے قریب رہنے سے حرارت خود بخود پہنچے گی۔ اس کے بعد کسی اور محنت کی ضرورت نہیں۔ گویا اصحاب ایمان کا قرب ہی کافی ہے۔

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالح ترا طالح کند

حصول ایمان کا دوسرا راستہ احکام خداوندی پر عمل پیرا ہونے کا راستہ ہے۔ ایمان اور عمل صالح دو طرفہ اثرات کے حامل ہیں۔ ایمان عمل صالح سے پیدا ہوتا ہے اور عمل صالح میں اضافہ ایمان میں اضافے کا ذریعہ بنتا ہے۔ گویا مسلسل عمل سے بھی ایمان پیدا ہوتا ہے۔ اس صورت حال کو تسلیم کرنے کے باوجود اب جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ بہت اہم ہے اور وہ بات یہ ہے کہ ان دونوں طریقوں سے جو ایمان پیدا ہوتا ہے وہ غیر شعوری ہوتا ہے۔ اس قسم کے ایمان کے ساتھ شعوری عنصر (Intellectual Element) شامل نہیں ہوتا۔ ان طریقوں سے جو ایمان پیدا ہوتا ہے ان کو Blind Faith کہنا زیادہ مناسب ہے۔ تاہم اس غیر شعوری ایمان کا بھی اثر عمل پر پڑے گا۔ چنانچہ ایسا ایمان رکھنے والا شخص بھی اس راہ میں کوئی قربانی دینے میں کمی نہیں کرے گا۔ یہ Blind Faith بھی بڑی نعمت ہے۔ لیکن یہ بات اچھی طرح

سمجھ لینی چاہئے کہ انقلابی عمل کے آغاز کے لئے بہرحال اس شعوری ایمان کی ضرورت ہے جس کے ساتھ Conviction شامل ہو اور یہ Conviction کسی نہ کسی Intellectual Element کی موجودگی کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ انقلابی عمل جب ان مراحل میں داخل ہو جائے' جب جان کی بازی کھیلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت یہ Blind Faith والے اگر مل جائیں تو یہ بھی بڑے قیمتی ثابت ہوں گے۔ اس لئے کہ اس وقت جان کی بازی کھیلنے کے لئے ان میں بھی پوری قوت اور آمادگی ہوتی ہے۔

شعوری ایمان اور اس کی اہمیت

شعوری ایمان کا تذکرہ سورۂ یوسف کی آیت ۱۰۸ میں اس طرح کیا گیا ہے :

﴿قل هذه سبیلی ادعوا الی الله علی بصیرة انا ومن اتبعنی﴾

"اے نبی! کہہ دیجئے کہ اے لوگو! یہ ہے میرا راستہ۔ میں اللہ کی طرف پوری بصیرت کے ساتھ بلا رہا ہوں اور وہ بھی جنہوں نے میری اتباع کی"[۱۵]

یہ بہت بڑی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے بشارت دلوائی ہے کہ نہ صرف آپ خود بلکہ آپ کے متبعین بھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مار رہے ہیں بلکہ نور بصیرت سے بہرہ ور ہیں۔ یہ وہ ایمان ہے جس کے ساتھ شعور اور بصیرت باطنی موجود ہے۔ اس قسم کے ایمان کے حصول کا واحد سرچشمہ اور منبع قرآن حکیم ہے۔ قرآن کے سوا یہ کہیں اور سے مل ہی نہیں سکتا۔ بقول مولانا ظفر علی خاں مرحوم ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکان فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

اس طرح علامہ اقبال نے ایک بہت اچھا شعر اپنی زندگی کے آخری ایام میں کہا ہے ؎

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گزشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے' علم نخیل بے رطب

گویا فرماتے ہیں کہ انہوں نے جتنا کچھ فلسفہ وغیرہ علوم پڑھے تھے وہ سب نخیل بے رطب

(نہ سمجھنے والا مجبور) تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دوسرے شعر میں فرماتے ہیں ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اس شعوری ایمان کا ذکر قرآن مجید بار بار مختلف اسالیب میں کرتا ہے۔ مثلاً سورۂ آل عمران میں شعوری ایمان رکھنے والوں کا ذکر اس طرح فرمایا ہے :

﴿الذين يذكرون الله قياما وقعودا وعلى جنوبهم ويتفكرون في خلق السموات والارض ' ربنا ما خلقت هذا باطلا﴾

"جو اللہ کا ذکر اٹھتے بیٹھتے کرتے ہیں اور پہلوؤں پر (لیٹے ہوئے بھی] اور آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے پر غور کرتے ہیں۔ (اور اس شعوری نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں کہ) اے ہمارے رب یہ سب کچھ تو نے بے مقصد پیدا نہیں کیا"۔

اسی طرح عقل و شعور اور فکر و تدبر کی اہمیت کے اظہار کے لئے لعلكم تعقلون ' لقوم يعقلون ' لعلكم تتفكرون ' افلا يتدبرون القرآن ' اور ليدبروا آياته وغیرہ مختلف اسالیب اختیار کئے گئے ہیں۔

قرآن مجید ہی شعوری ایمان کا سرچشمہ ہے۔ اس حقیقت کے عقلی دلائل کے علاوہ نقلی دلائل بھی موجود ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ بات کہ نبی اکرم ﷺ کی دعوت کے لئے جتنی بھی اصطلاحات قرآن مجید میں وارد ہوئی ہیں ان سب کے لئے قرآن ہی کو ذریعہ اور وسیلہ معین کیا گیا ہے مثلاً

﴿فذكر بالقرآن﴾ (ق : ۴۵)

"تم اس قرآن کے ذریعہ تذکیر کرو"

﴿قل اوحى الى هذا القرآن لانذركم به﴾ (الانعام : ۱۹)

"کہئے میری طرف یہ قرآن نازل کیا گیا تاکہ میں اس کے ذریعہ "انذار" کروں"۔

﴿فانما يسرناه بلسانك لتبشر به المتقين وتنذر به

﴿قوما لدا﴾ (مریم : ۹۲)

"تو ہم نے اس کو تمہاری زبان پر صرف اس لئے رواں کر دیا ہے کہ تم اس کے ذریعے متقین کو تبشیر کرو اور جھگڑالو قوم کو انذار"

﴿بلغ ما انزل الیک من ربک﴾ (المائدہ : ۶۷)

"تبلیغ کریں اس کی جو آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا"۔

﴿وجاھدھم بہ جہادا کبیرا﴾ (الفرقان : ۵۲)

"اور اس (قرآن) کے ذریعہ ان سے جہاد کبیر کیجئے"۔

دیکھئے تبلیغ "تذکیر" "انذار" "تبشیر" اور "جہاد" سب کے لئے قرآن حکیم کو وسیلہ بنانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ جہاں بھی جاتے وہاں لمبے چوڑے خطبے دینے کے بجائے قرآن مجید ہی پڑھ کر سناتے تھے۔

شعوری ایمان کے ثمرات

چنانچہ اس انقلابی جدوجہد کا پہلا قدم "دعوت ایمان بذریعہ قرآن" ہے۔ اس طرح سے جو حقیقی ایمان حاصل ہوگا اس کے نتیجے میں سب سے پہلے انسان کا عمل درست ہوگا۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ دل میں حقیقی ایمان ہو اور عمل درست نہ ہو ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔

دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا جو کچھ اللہ تعالیٰ نے بندے کو عطا کیا ہے یعنی اسے اپنے جسم و جان اور مال و منال پر جو مخصوص خلافت عطا کی ہے اس سے کام لے کر وہ اپنا سب کچھ اللہ کے دین کی راہ میں کھپا دے گا۔ میں نے پہلے خطبہ خلافت میں بتایا تھا کہ خلافت کی ایک قسم خلافت مخصوص ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو کچھ عطا کیا ہے اس کے استعمال میں ہم مخصوص طور پر خلیفہ کی حیثیت سے کام کرنے پر مامور ہیں۔ اس مخصوص خلافت کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اصل مالک جس کام میں ان چیزوں کو کھپانے کا حکم دیتا ہے اس کام میں ان کو بے دریغ کھپا دیا جائے۔ چنانچہ سورۂ حدید میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿آمنوا باللہ ورسولہ وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ﴾ (الحدید : ۷)

یعنی "ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور (اس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ خرچ کرو اس میں سے جس میں اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔"

ایمان حقیقی کا تیسرا نتیجہ "جہاد" ہے۔ یہ ایمان کا منطقی نتیجہ ہے جیسا کہ سورۂ صف کی درج ذیل آیت کے حوالے سے بتا چکا ہوں کہ:

﴿ تومنون باللہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم ﴾

"تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں سے"۔

چوتھا نتیجہ "تزکیہ" ہے۔ تزکیہ حقیقتاً کوئی علیحدہ عمل[۱۶] عمل نہیں ہے۔ یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ایمان میں جتنی گہرائی بڑھتی چلی جائے گی منطقی طور پر اس کا باطن اتنا ہی زیادہ منور ہوتا چلا جائے گا۔ نور ایمان سے ظلمات اور تاریکیاں چھٹتی چلی جائیں گی۔ یہ ہے تزکیہ اور تجلیہ باطن کا نبوی طریقہ[۱۷]

میں نے منہج انقلاب نبوی کے دو مراحل کو یکجا کر کے ان کو ایک مرحلے کے طور پر بیان کر دیا ہے۔ یعنی دعوت ایمان اور تزکیہ۔

انقلاب کے لئے سب سے پہلے ایسے مردان کار کی ضرورت ہے جن کے قلوب و اذہان نور ایمان سے منور ہو چکے ہوں۔[۱۸] یہ لوگ آپ کی دعوت سے اس انقلابی فکر کی طرف کھنچیں گے۔ یہ دعوت، دعوت ایمان ہوگی اور اس کا ذریعہ قرآن ہوگا۔ اب ان جانثاروں کی تربیت و تزکیہ ہوگا۔ اور تزکیہ کا یہ عمل بھی قرآن ہی کے ذریعہ ہوگا۔ گویا یہ دونوں عمل یعنی دعوت اور تزکیہ قرآن کے گرد گھوم رہے ہیں۔ یہ مضمون قرآن حکیم میں چار مقامات پر آیا ہے۔ چنانچہ سورۂ جمعہ میں ارشاد ہے:

﴿ ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ ﴾ (الجمعہ: ۲)

"وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرمایا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی

تعلیم دیتا ہے"۔

یہ مضمون سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۴ میں ان الفاظ میں وارد ہوا ہے:

﴿لقد من الله على المؤمنين اذ بعث فيهم رسولا من انفسهم يتلوا عليهم ايته ويزكيهم ويعلمهم الكتب والحكمة وان كانوا من قبل لفي ضلل مبين﴾

"اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں ایک رسول انہی میں سے اٹھایا۔ وہ ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے"۔

ان دو مقامات کے علاوہ یہی مضمون سورۂ بقرہ میں بھی دو مقامات[19] پر آیا ہے اور یہ سارا عمل دراصل مردان کار کی تیاری ہے۔ یہ جاں نثار مجاہد تیار ہوں گے تو جہاد کا عمل شروع ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلنے والے چھ لاکھ افراد تھے جو بارہ قبیلوں میں تقسیم تھے۔ مگر تربیت نہ ہونے کے باعث یہ بڑے "بودے" لوگ تھے۔ جب مصر سے ہجرت کے بعد قتال کا مرحلہ آیا، اور حضرت موسیٰ نے قوم کو اس فرض کی ادائیگی کے لئے پکارا تو انہوں نے جواب دیا:

﴿فاذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قعدون۝﴾

(المائدہ: ۲۴)

"(موسیٰ) تم اور تمہارا رب (دونوں) جاؤ اور جنگ کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں"۔

تو جناب موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کی:

﴿قال رب انى لا املك الا نفسى واخى فافرق بيننا وبين القوم الفسقين۝﴾ (المائدہ: ۲۵)

"(موسیٰ نے) کہا میرا بس نہیں ہے مگر اپنے آپ پر اور اپنے بھائی پر تو اے میرے رب! ہمارے اور ان بگڑے ہوئے (فاسق) لوگوں کے درمیان تفریق کر دے (میں ان نابکاروں کے درمیان رہنے پر تیار نہیں ہوں کہ فرعون کی غلامی سے نجات پانے اور اپنے عظیم معجزوں کو دیکھ لینے کے باوجود جن کا یہ حال ہے)"[20]

اس کے مقابلے میں مکے سے ہجرت کے بعد جب بدر کا مرحلہ آیا اور نبی ﷺ نے اپنے مسلح تین سو تیرہ اصحاب سے قریش کے لشکر جرار کا مقابلہ کرنے کے لئے مشورہ طلب کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ حضور ہمیں حضرت موسیٰ کے ساتھیوں پر قیاس نہ فرمائیں جنہوں نے کہہ دیا تھا کہ "تم اور تمہارے رب (دونوں) جاؤ اور جنگ کرو۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں"۔ ہم تو آپ کے آگے سے آپ کے پیچھے سے آپ کے دائیں سے اور آپ کے بائیں سے جنگ کریں گے۔ اسی لئے اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے کہا تھا ؂

خدا کے کام دیکھو! بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غار حرا پہلے

غار حرا ہی سے تو نزول قرآن شروع ہوا تھا۔ اور بقول مولانا الطاف حسین حالی وہیں سے مس خام کو کندن بنانے والا نسخہ کیمیا (قرآن) ہاتھ آیا تھا ؂

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سیرت نبوی کے ابتدائی پندرہ برس تک اسی نسخہ کیمیا سے کیمیا گری ہوتی رہی۔ دعوت و تبلیغ سے لے کر تزکیہ نفوس تک تمام مراحل قرآن کے ذریعے ہی طے ہوتے رہے۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد بدر کا مرحلہ آیا۔ تاریخ میں ہمیں بدر کا مرحلہ بہت اہم نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں اہم وہ مرحلہ ہے کہ جس مرحلہ میں بدر کے لئے لوگ تیار کئے گئے۔

تنظیم کا مرحلہ

ان مردان کار کی تیاری کے بعد جو دوسرا مرحلہ آتا ہے وہ ہے تنظیم کا مرحلہ ہے۔ وہ لوگ جو اس دعوت ایمان کے نتیجے میں تزکیہ نفوس کے مراحل سے گزر کر اپنی ذات پر اللہ کا دین قائم کر چکے جب تک انہیں کسی مضبوط تنظیم کے اندر جوڑا نہیں جائے گا یہ کچھ نہ کر سکیں گے[۳۰]۔ چنانچہ نبی ﷺ نے جماعت کی اہمیت کو بہت واضح کیا ہے۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے "آمرکم بخمس" کہ مسلمانو! میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں "اللہ امرنی بہن" یعنی اللہ نے مجھے ان (باتوں) کا حکم

دیا ہے(۲۱)۔ وہ پانچ باتیں کیا ہیں؟ جن کا آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا ہے۔

بالجماعة والسمع والطاعة والهجرة والجهاد في سبيل الله

یعنی التزام جماعت کا (حکم) سننے کا (حکم) ماننے کا (حکم) (راہ خدا میں ترک وطن)
یعنی ہجرت کا اور اللہ کی راہ میں جہاد کا (حکم)

ہمارے فکری افلاس اور بدقسمتی کی حد یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے اس قول مبارک کی طرف مسلمانوں کی توجہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ ہماری اکثریت تو گویا اس کے وجود ہی سے بے خبر ہے۔ جبکہ وہ حدیث جس میں ارکان اسلام کا ذکر ہے خوب شہرت رکھتی ہے۔ بلکہ تقریباً ہر مسلمان کے ذہن میں اس کا مفہوم موجود ہے۔ جبکہ دونوں احادیث مبارکہ میں پانچ پانچ باتوں ہی کا ذکر ہے جبکہ ارکان اسلام والی حدیث تو خبریہ اور یہ حدیث امر (حکم) کی صورت میں ہے۔

ہماری اس محرومی کی وجہ یہ ہے کہ جب نظام خلافت ختم ہوا تو اس کے بعد ملوکیت آ گئی۔ ملوکیت دو طرح کی آئی۔ پہلے مسلمانوں کی ملوکیت آئی' اس کے بعد غیر مسلموں کی ملوکیت۔ چنانچہ بلاد اسلامیہ کے اکثر حصے مغربی اقوام کی غلامی میں آ گئے۔ ہم برِاعظم پاک و ہند کے مسلمان انگریزوں کے غلام تھے۔ غلامی کے دور میں نماز روزہ تو چلتا رہا۔ لہٰذا اس کا تصور تو ذہنوں میں موجود رہا جبکہ جہاد و قتال' انقلاب اور اقامت دین ذہنوں سے نکلتے چلے گئے۔ اور پھر آ نکھ او جھل پہاڑ او جھل والی کیفیت پیدا ہو گئی۔

(خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا) بہرحال انقلابی جدوجہد کے دوسرے مرحلے میں "جماعت" کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ اس جماعت کا نظم بھی فوجی انداز کا مقرر کیا گیا ہے کہ افسر جو حکم دے اسے سنو اور مانو۔ تمہیں یہ حق نہیں کہ اس سے پوچھ سکو کہ یہ حکم کیوں دے رہے ہو' اس حکم کی حکمت اور غرض و غایت کیا ہے' جو حکم تم دے رہے ہو وہ معقول بھی ہے یا نہیں' آپ کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ پہلے مجھے سمجھاؤ تب میں حکم مانوں گا۔ اگر کسی فوج میں سوال جواب کا یہ سلسلہ شروع ہو جائے تو پھر وہ فوج

کہلانے کی مستحق نہیں رہتی [۲۲]۔ گویا اس جماعت کو سمع و طاعت کا خوگر ہونا چاہئے۔ اسی کی یاد دہانی کراتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: اذ قلتم سمعنا و اطعنا" (یعنی یاد کرو) جب تم نے کہا تھا ہم نے سنا اور اطاعت کی" سورۂ بقرہ کی آخری آیت سے پہلے کی آیت میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿وقالوا سمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر﴾

"اور انہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔ ہم تیری بخشش کے طلبگار ہیں اے ہمارے رب! اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے"۔

قرآن حکیم میں آپ کو سمع و طاعت کی اصطلاح بار بار ملے گی۔ یہ دونوں اصطلاحات گاڑی کے دو پہیوں کی طرح ساتھ ساتھ آتی ہیں۔ کیونکہ کسی انقلابی جماعت کا ان کے بغیر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ [۲۳]

نظم جماعت کی بنیاد --- بیعت

محمد رسول اللہ ﷺ نے نظم جماعت کو بیعت کی بنیاد پر استوار کیا۔ خود قرآن مجید میں سورۂ فتح آیت نمبر ۱۰ میں بھی بیعت کا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا [۲۴]:

﴿ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم﴾

"(اے نبی!) بیشک جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ تو اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے"۔

عام طور پر بیعت لینے کی عملی شکل یہ ہوتی ہے کہ جو شخص بیعت کرتا ہے اس کا ہاتھ اوپر ہوتا اور جس کے ہاتھ پر بیعت کی جاتی ہے اس کا ہاتھ نیچے ہوتا ہے۔ اس آیت میں بتایا یہ جا رہا ہے کہ بیعت کرتے ہوئے ایک ہاتھ آپ کا ہے' ایک بیعت کرنے والے کا ہے اور ایک تیسرا ہاتھ بھی ہے جو اللہ کا ہے مگر وہ نظر نہیں آتا۔ یہ اللہ کا ہاتھ اس لئے ہے کہ جو سودا (بیعت) ہو رہا ہے وہ دراصل اللہ کے ساتھ ہو رہا ہے۔

سورۂ توبہ میں "بیع و شراء" دونوں الفاظ اپنی پوری جامعیت کے ساتھ اطاعت کلی

کے قول و قرار اور عہد و پیمان کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ، یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون ویقتلون، وعدا علیہ حقا فی التوراۃ والانجیل والقرآن، ومن اوفی بعھدہ من اللہ فاستبشروا ببیعکم الذی بایعتم بہ، وذلک ھو الفوز العظیم ۝﴾

"یقیناً اللہ نے مومنوں سے ان کی جان اور ان کے مال جنت کے بدلے میں خرید لئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے یہ پختہ وعدہ ہے توراۃ میں، انجیل میں، اور قرآن میں بھی، بھلا اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا کون ہے۔ تو خوش ہو جاؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے کیا ہے۔ اور یہی عظیم کامیابی ہے"۔

رہا یہ سوال کہ اس دنیا میں یہ فروخت شدہ جان و مال اللہ کے دین کے غلبے اور نظام خلافت کو برپا کرنے میں کیسے لگتا ہے؟ تو ظاہر بات ہے کہ کسی نظم جماعت ہی کے تحت اسے لگانا ہوگا۔ اور اس نظم جماعت کا جو صاحب امر ہے اس کے ہاتھ پر بیعت سمع و طاعت کرنی ہوگی۔ اس وقت صاحب امر حضرت محمد ﷺ خود تھے اور بنفس نفیس موجود تھے لہٰذا آپ ہی کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ اگرچہ حضور ﷺ کو بیعت لینے کی ضرورت نہ تھی اس لئے کہ آپ رسول اور نبی تھے اور آپ پر ایمان لانے والا ہر شخص آپ کی اطاعت کا پابند تھا۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے ﴿وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ﴾ (ہم نے کوئی رسول بھیجا ہی نہیں مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے) ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے ﴿من یطع الرسول فقد اطاع اللہ﴾ (جو رسول کی اطاعت کرے گا تو یقیناً اس نے اللہ کی اطاعت کی)۔[۲۵]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ بیعت کے بغیر بھی مطاع تھے تو آپ نے بیعت کیوں لی؟ کیا نعوذ باللہ آپ نے ایک بے ضرورت کام کیا! نہیں ہرگز نہیں، وجہ یہ ہے کہ اگر آپ بیعت نہ لیتے تو بعد میں آنے والوں کے لئے اسوہ کہاں سے آتا! اس لئے کہ اب

آپ ؐ کے بعد کوئی نبی تو آنے والا نہیں ہے۔ حضرت مسیح ؑ بھی آئیں گے تو نبی کی حیثیت میں نہیں آئیں گے۔ وہ تو نماز کی امامت بھی نہیں کرائیں گے اور امامت کرنے کی دعوت کے جواب میں کہیں گے امامکم منکم (تمہارا امام تم ہی میں سے ہوگا)۔ چنانچہ اب خلافت کے قیام کے لئے جو بھی جماعت بنے گی وہ اسوۂ رسول پر ہی بنے گی۔ حضور ﷺ نے بیعت کا اسوہ اسی لئے چھوڑا ہے کہ یہ امت مسلمہ کی ضرورت تھی۔ اس بیعت کا ذکر کئی احادیث مبارکہ میں بھی موجود ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے وہ شعر نقل کیا ہے جس میں اس بیعت کا ذکر ہے اور جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غزوۂ احزاب میں بطور رجز خندق کھودتے ہوئے پڑھ رہے تھے

نحن الذین بایعوا محمدا
علی الجہاد ما بقینا ابدا

(ہم وہی تو ہیں جنہوں نے محمد ﷺ سے زندگی کی آخری سانس تک جہاد جاری رکھنے کی بیعت کی ہے)

ایک اور حدیث مبارکہ میں اس بیعت کا ذکر نہایت جامعیت کے ساتھ آیا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اس حدیث مبارکہ میں ایک اسلامی جماعت کا پورا دستور موجود ہے۔ حدیث کا متن اس طرح ہے:

> عن عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ قال: بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ وعلی اثرۃ علینا وعلی ان لا ننازع الامر اھلہ وعلی ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی اللہ لومۃ لائم۔ وفی روایۃ وان لا ننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفرا بواحا عندکم فیہ من اللہ برھان (متفق علیہ)

"عبادہ بن الصامت ؓ نے روایت کیا ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے تنگی اور آسانی، خوشی اور ناخوشی، ہر حالت میں، حتیٰ کہ اپنے اوپر کسی کو ترجیح دیئے کے باوجود سمع و طاعت کی بیعت کی، اور اس بات پر بیعت کی کہ اہل حکم (اولو

> الامر سے اختیارات کے معاملے میں نزاع نہ کریں گے' اور حق بات کہیں گے جہاں بھی ہوں' اللہ کے معاملے میں (یعنی خدا لگتی کہنے میں) کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ہم اہل امر سے نزاع نہیں کریں گے' الا یہ کہ تم (ان کے اندر) کھلا کفر دیکھو جس پر تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل موجود ہو"۔

اسلامی اجتماعیت کے تقاضے

یہ بیعت جہاد اور بیعت تنظیم کا نقشہ ہے جو اس حدیث مبارک میں دیا گیا ہے۔ یہ پیری مریدی والی بیعت نہیں ہے جسے ہمارے ہاں بیعت ارشاد سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن حسرت و افسوس کی بات ہے کہ ان واضح احادیث کی موجودگی میں بھی ہماری دینی جماعتوں نے بیعت کے اس نظام کو اختیار نہیں کیا۔ ان کے ہاں بھی وہی ممبری اور الیکشن کا نظام رائج ہے جو غیروں سے مستعار لیا گیا ہے۔ جبکہ اس نظام میں بے شمار فتنے پیدا ہونے کا تجربہ ہو چکا ہے اور نبی اکرمؐ نے جو نظم عطا کیا ہے وہ تمام فتنوں کا سد باب کر دیتا ہے۔

ایک بار پھر سمجھ لیجئے کہ اگر آپ واقعتاً انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کسی حکم کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی تعمیل مشکل ہے' یا میرے حالات تعمیل حکم کی اجازت نہیں دیتے یا یہ کہ میرا "موڈ آف" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے بیعت میں فی العسر والیسر' اور فی المنشط والمکرہ کے الفاظ شامل کئے۔ کہ آسانی ہو یا دشواری' تنگی ہو یا سہولت' طبیعت آمادہ ہو یا نہ ہو' حکم بہر صورت بجالانا پڑے گا۔

انقلابی جماعت سے تعلق رکھنے والا یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں حکم یا فیصلہ اس لئے نہیں مانوں گا کہ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یا مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ یا یہ حکم میرے نزدیک خلاف مصلحت ہے۔ اجتماعی فیصلوں اور احکام میں سب کا اتفاق کرنا ضروری نہیں۔ فیصلہ ہو جانے کے بعد اختلاف رکھنے والوں کو بھی فیصلے پر عمل کرنا ہوگا۔ چنانچہ غزوہ احد میں حضورؐ کی رائے بھی یہی تھی کہ مدینے میں رہ کر حملہ آور لشکر کا مقابلہ کیا جائے اور رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی رائے بھی اتفاق سے یہی تھی' خواہ اسکی

رائے کے اسباب کچھ بھی ہوں۔ حضور ﷺ نے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے جوش و جذبہ کو دیکھ کر فیصلہ فرمادیا کہ مقابلہ کھلے میدان میں ہو گا۔ یہ اجتماعی فیصلہ تھا اور اجتماعی نظم کا تقاضا یہ ٹھہرا کہ سب اسی پر عمل کریں۔ مگر عبداللہ ابن ابی اپنے ساتھ تین سو آدمیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔ اس نے کہا کہ جب ہماری بات نہیں مانی جاتی تو ہم اپنی جانوں کو کیوں خطرے میں ڈالیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو بیعت لی گئی تھی اس میں اس فتنے کا سدباب بھی کر دیا گیا ہے اور فی المنشط والمکرہ کے الفاظ کو بیعت میں شامل کر کے یہ طے کر دیا گیا کہ کسی کی طبیعت آمادہ ہو یا اس کو اپنی طبیعت پر جبر کرنا پڑے اجتماعی فیصلہ تسلیم کرنا ہو گا۔ اطاعت امیر ہر حال میں کرنی ہو گی۔

لفظ "منشط" نشاط سے بنا ہے۔ یعنی خوشدلی کی حالت میں آپ کو جو حکم دیا جائے گا اور آپ کی اپنی رائے بھی جس حکم سے ہم آہنگ ہو گی تو ظاہر ہے کہ آپ اس حکم یا فیصلے پر خوش دلی سے عمل کریں گے۔ اگر صورت حال برعکس ہے اور آپ کی رائے مختلف ہے تو آپ کو اپنی طبیعت پر جبر کرنے پڑے گا۔ ان دونوں حالتوں میں حکم یا فیصلہ بہر حال ماننا ہو گا۔

اس حدیث مبارکہ میں جماعتی زندگی میں نمودار ہونے والے ایک اور بہت بڑے فتنہ کا سدباب بھی کر دیا گیا ہے۔ اور وہ فتنہ ہے کہ جس کو امیر مقرر کیا گیا ہے کوئی شخص یہ سمجھ بیٹھے کہ میں اس امیر سے زیادہ اہل ہوں مثلاً یہ خیال کرے کہ یہ شخص تو ابھی جماعت میں نیا داخل ہوا تھا۔ جماعت کے ساتھ میری وابستگی پرانی ہے۔ میری قربانیاں زیادہ ہیں۔ لیکن بیعت کے الفاظ میں اس فتنے کا سدباب ان الفاظ میں کر دیا گیا ہے وعلی اثرة علینا (یعنی ہم سمع و طاعت کے پابند رہیں گے خواہ ہم پر کسی اور کو (ہمارے خیال کے مطابق بےجا) ترجیح بھی دی گئی ہو۔ اسی لئے آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ

من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ
ومن اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصی امیری فقد
عصانی

"جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی"

ہم سیرۃ نبوی میں دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے غزوہ موتہ میں حضرت زید بن حارثؓ کو لشکر کا سردار مقرر کر دیا۔ جو آپ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ (۲۶) حالانکہ اس لشکر میں حضورؐ کے چچازاد بھائی حضرت جعفر بن طالبؓ بھی تھے جو خاندان بنو ہاشم کے چشم و چراغ ہیں۔

پھر غزوۂ موتہ کے شہداء کا انتقام لینے اور قیصر روم سے جنگ کے لئے آپ نے اپنی حیات مبارکہ کا جو آخری لشکر روانہ کرنے کا فیصلہ کیا اس کا سردار حضرت زیدؓ کے بیٹے اسامہؓ کو مقرر کیا۔ ان کے والد موتہ کی جنگ میں شہید ہو گئے۔ حضرت اسامہؓ کے لشکر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ جیسے اکابر صحابہ بھی شامل تھے مگر آنحضرت ﷺ نے حضرت اسامہؓ کو لشکر کا سردار بنا دیا۔ (۲۷) اس عملی نمونہ کے علاوہ آپ نے ایک حکم کے ذریعہ بھی ہدایت فرمائی ہے کہ اگر کوئی کن کٹا حبشی بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے تو اس کی بھی اطاعت کرو۔

یہ ہے وہ صاف سیدھا منظم جماعت جو ہمیں احادیث نبویہ سے ملتا ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی سرے سے موجود ہی نہیں۔ چنانچہ ہم سیرت مطہرہ میں دیکھتے ہیں کہ غزوۂ احد کے موقع پر حضورؐ نے پشت کے درے پر پچاس تیر انداز مقرر کئے تھے۔ آپ کا حکم یہ تھا کہ چاہے ہم سب ہلاک ہو جائیں اور پرندے ہمارا گوشت نوچ نوچ کر کھانے لگیں تب بھی تم اس جگہ سے نہ ہلنا۔ لیکن جب ابتدائی فتح ہو گئی تو تیر اندازوں میں سے ۳۵ نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ مقامی کمانڈر آخر وقت تک ان سے کہتے رہے کہ تم کو یہاں سے ہٹنے کی اجازت نہیں۔ بہرحال تیر اندازوں کی اس غلطی کا نتیجہ یہ نکلا کہ خالد بن ولید (جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے) پہاڑی سے گھوم کر درے کی طرف سے آئے اور مسلمانوں کی پشت پر سے حملہ کر دیا۔ چنانچہ فتح شکست میں تبدیل ہو گئی اور ستر صحابہؓ نے جام شہادت نوش کیا۔

یہ اس انقلابی دعوت کا دوسرا مرحلہ ہے۔ پہلا مرحلہ مردان کار کی فراہمی۔ یہ

فراہمی دعوت ایمان بذریعہ قرآن ہوگی۔ دعوت قبول کرنے والوں کو جوڑنا ہوگا۔ اینٹیں علیحدہ علیحدہ نہیں ہوں گی۔ دیوار میں لگیں گی تب فصیل بنے گی۔ پھر اینٹیں بھی پختہ ہونی چاہئیں اور ان کو جوڑنے والا مصالحہ بھی مضبوط ہونا چاہئے یہ مصالحہ یا مضبوط سیمنٹ نظام بیعت ہے جو آپ ﷺ نے دیا ہے۔

بہرحال نظم جماعت کے دوسرے طریقوں کو میں حرام نہیں کہتا۔ دوسرے طریقے بھی مباح ہیں لیکن مسنون اور ماثور طریقہ صرف بیعت ہے۔ یہ ہماری بڑی محرومی ہے کہ ہم نے اس طریقے کو چھوڑ کر غیروں کے طریقے مستعار لے لئے ہیں۔ بقول شاعر ؎

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں الجھ کر اکثر
تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیئے
نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے عوض
اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے

ہم نے ‘الحمد للہ’ مسنون طریقہ ہی کو اختیار کیا ہے۔ البتہ اس حوالے سے یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ اب حضور ﷺ کے بعد جس کی بیعت ہوگی اس کی اطاعت مطلق نہیں ہوگی۔ حضور ﷺ کی اطاعت البتہ مطلق تھی۔ آپ کا ہر حکم واجب العمل ہے۔ اس لئے کہ آپ کوئی غلط حکم دے ہی نہیں سکتے تھے۔ آپ معصوم تھے لیکن آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی اطاعت بھی مطلق نہیں ہے۔ اب جس کی بھی بیعت ہوگی "اطاعت فی المعروف" کی قید کے ساتھ ہوگی۔ امیر کا حکم جو شریعت کے دائرے میں ہو وہی مانا جائے گا۔ چنانچہ ہم نے تنظیم اسلامی کے دستور میں بیعت کا جو نظام رکھا ہے اس میں "فی المعروف" کا اضافہ کر کے بیعت کے الفاظ اس طرح کر دیئے ہیں۔ "نبایعک علی السمع والطاعۃ فی المعروف"۔ ان دو الفاظ کے علاوہ باقی الفاظ بیعت وہی ہیں جو اس حدیث مبارکہ میں آئے ہیں۔

ہم نے انقلابی جدوجہد کے جن دو مراحل کا اب تک ذکر کیا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں ان کو خوبصورتی سے سمو دیا ہے ؎

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

(نشہ درویشی کے ساتھ راہ پیدا کرو اور مسلسل جدوجہد جاری رکھو۔ جب پختہ ہو جاؤ تب سلطنت جم پر ٹوٹ پڑو)۔ یہ دعوت و تبلیغ بھی درویشوں کا کام ہے۔ اسی طرح تربیت و تزکیہ کا عمل بھی درویشی کا عمل ہے۔ تنظیم کے ساتھ پوری طرح چمٹ جانا یہ سب سے بڑی درویشی ہے۔ اس لئے کہ اس میں نفس کو سب سے زیادہ مارنا پڑتا ہے۔ کسی دوسرے کا حکم ماننا کوئی آسان کام ہے ۱۱ حضور ﷺ کے عہد میں "منافقت" کا رویہ اپنانے والوں میں ایک بڑی تعداد کی بیماری یہی تھی کہ ان کو آپؐ کی اطاعت گراں گزرتی تھی۔ آپ انہیں کہتے کہ قتال کے لئے نکلو تو وہ کہتے کہ قتال کے حکم پر مبنی کوئی آیت کیوں نہیں نازل ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے نفاق کا پردہ چاک کرنے کے لئے سورۃ محمد میں آیت محکمہ بھی نازل کر دی۔ مگر ان کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ حضور کا حکم کیوں مانیں؟ کہتے تھے کہ بس قرآن کی بات مانیں گے۔ یہ فتنہ آج بھی موجود ہے کہ "حسبنا کتاب اللہ" {۳۸} بات وہی ہے کہ کسی دوسرے حکم کیوں مانیں۔ یہ سب نفس امارہ کی شرارت ہے۔ اسی لئے عرض کر رہا ہوں کہ کسی کی اطاعت کرنے میں چونکہ نفس امارہ کو مارنا پڑتا ہے اس لئے خود کو کسی کی اطاعت کا خوگر بنانا "تزکیہ نفس" کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

درویشی کے چار عناصر

گویا چار کام مسلسل کرتے رہنا ہیں۔ ان چار کاموں سے درویشی کے چار عناصر پورے ہو جاتے ہیں۔

(i) پہلا کام یہ کہ "دعوت ایمان بذریعہ قرآن" مسلسل جاری رکھو

(ii) دوسرا کام یہ کہ قرآن ہی کے ذریعہ تزکیہ کا عمل بھی مسلسل جاری رہنا چاہئے۔

(iii) تیسرا کام یہ کہ اپنے آپ کو نظم کا خوگر بنالو۔ سمع و طاعت کی روش کو مسلسل پروان چڑھاتے رہو۔

(iv) چوتھا عنصر یہ کہ ہر قسم کے اشتعال دلانے کے مقابلے میں صبر سے کام لو۔ نہ تو مشتعل ہو، نہ مایوس ہو کہ دعوت انقلاب ترک کر دو۔ نہ طاقتور کے سامنے جھک جاؤ۔

بلکہ اس حد تک صبر سے کام لو کہ کوئی گالی بھی دے تو جواب میں گالی نہ دو۔ کوئی پتھر مارے تو صبر سے کام لو اور اس کے حق میں دعا کرو کہ اے اللہ! اس کو ہدایت دے۔ اس لئے کہ "فانہم لا یعلمون" "وہ نہیں جانتے (کہ وہ کیا کر رہے ہیں) صبر میں ایسا مقام بھی آ سکتا ہے کہ تمہارے جسم کے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں لیکن تم کو یہ سب کچھ جھیلنا ہے۔ خواہ کتنا ہی تشدد کیا جائے مگر تمہاری طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہیں ہونی چاہئے۔ سیرۃ مطہرہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مکے میں بارہ سال تک یہی عمل جاری رہا۔ حضرت سمیہؓ اور حضرت یاسرؓ کو شہید بھی کر دیا گیا لیکن کوئی جوابی کارروائی نہیں کی گئی۔ حالانکہ اس وقت مکہ مکرمہ میں چالیس صحابہ موجود تھے۔ اور یہ بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ وہ بزدل نہ تھے۔ پھر بدلہ نہ لینے کی وجہ کیا تھی؟ ابو جہل کا ہاتھ کیوں نہ روکا گیا؟ محض اس لئے کہ حضور ﷺ کی طرف سے طاقت کے استعمال کی اجازت نہ تھی' حکم یہ تھا کہ "کفوا ایدیکم" "اپنے ہاتھ روک رکھو" بقول اقبال ؂

نغمہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

فی الحال ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں۔ وقت آنے پر تمہارے ہاتھ کھول دیئے جائیں گے۔ اس مرحلے کے آنے سے پہلے اپنے اندر سر تسلیم خم کرنے کی خو کو پروان چڑھانا ہوگا۔ یہ چار کام وہ ہیں جنہیں علامہ اقبال "بانشہ درویشی در ساز و دمادم زن" میں سمو دیا ہے۔ ان چار مراحل سے گزرنے کے بعد وہ مرحلہ آئے گا کہ جسے علامہ اقبال نے "چوں پختہ شوی' خود را بر سلطنت جم زن" سے تعبیر کیا ہے۔

حق و باطل کا تصادم

جب یہ لوگ آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزر کر کندن بن جائیں' تب نظام باطل کے ساتھ ٹکراؤ ہوگا۔ اس تصادم کے بغیر نظام نہیں بدلا کرتے۔ یہ انقلابی جدوجہد کا تیسرا مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں تصادم ناگزیر ہے۔ نظام باطل ٹھنڈے پیٹوں تو حق کو برداشت

نہیں کرے گا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر پوری انسانی تاریخ گواہ ہے کہ تصادم کے بغیر کبھی نظام نہیں بدلا۔ امریکی قوم نے اپنے ہاں سے غلامی کی لعنت ختم کرنے کے لئے کتنا خون دیا۔ پہلے افریقہ سے آزاد لوگوں کو قیدی بنا بنا کر لایا گیا اور ان کو غلام بنا لیا گیا۔ جب یہ طے ہوا کہ اب آدم زادہ خود شناس اور خود نگر ہو گیا ہے اس لئے اب ان کو غلام نہیں رکھا جا سکتا' ان کو آزاد کرنا ہوگا تو اس مسئلہ پر پوری امریکی قوم تقسیم ہو گئی۔ نتیجتاً خانہ جنگی ہوئی۔ اور غلامی ختم کرنے کے لئے لاکھوں انسانوں کو ہر طرح کی قربانی دینی پڑی۔

بہرحال نظام بدلنے کے لئے ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ اس موقع پر مجھے علامہ اقبال کا ایک فارسی شعر یاد آ رہا ہے۔ جو انہوں نے نجانے کس کیفیت میں لکھا ہے۔ کہتے ہیں ؎

گفتند جہان ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ میرا پیدا کردہ یہ جہاں تمہارے ساتھ سازگاری کر رہا ہے؟ میں نے جواب دیا نہیں' سازگاری نہیں کر رہا' تو اللہ تعالیٰ نے پھر فرمایا اسے درہم برہم کر دو۔ توڑنے اور درہم برہم کرنے کا یہ عمل کیسے ہوگا؟؟ اس بات کو علامہ اقبال نے اپنی نظم کے اگلے شعر میں بیان کیا ہے۔

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

(نشہ درویشی سے راہ پیدا کرو اور مسلسل جدوجہد جاری رکھو (پھر) جب پختہ ہو جاؤ تو خود کو سلطنت جم سے ٹکرا دو۔)

نبی اکرم ﷺ کی مکی زندگی کا ۱۲ سالہ دور اس شعر کے پہلے مصرعے کی تشریح بن سکتا ہے۔ دیکھئے! اس دور میں دعوت و تبلیغ کا کام مسلسل جاری ہے۔ اس عمل دعوت کے دوران گالیوں کے جواب میں دعائیں دی جا رہی ہیں اور پتھروں کے جواب میں پھول برسائے جا رہے ہیں۔ مکی دور میں کسی جوابی کارروائی کا سراغ نہیں ملتا۔ اس کے ساتھ ساتھ تزکیہ کا عمل بھی جاری ہے۔ دن اگر تبلیغ و دعوت کے لئے وقف ہے تو راتیں اللہ کے حضور کھڑے ہو کر گزاری جا رہی ہیں۔ سورۃ مزمل میں ہے۔

﴿ان ربك يعلم انك تقوم ادنى من ثلثى الليل ونصفه
وثلثه وطائفة من الذين معك﴾

"یقیناً آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھ جو لوگ ہیں ان میں سے بھی ایک گروہ (کبھی) دو تہائی رات (کبھی) آدھی رات، اور (کبھی) ایک تہائی رات سے نماز تہجد کے لئے کھڑے ہو جاتے ہو۔"

پھر دعوت اور تزکیہ کے اس عمل سے گزر کر جب اہل حق پختہ ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ مدینہ منورہ کی "Base" عطا فرما دیتا ہے۔ نبی ﷺ تو اس Base کی تلاش میں طائف تشریف لے گئے تھے مگر طائف سے آپ ناکام لوٹے۔ طائف میں آپ پر پتھراؤ کیا گیا۔ جسم اطہر لہولہان ہو گیا۔ ایسے ایسے فقرے اور جملے سننے کو ملے جو تیروں کی مانند کلیجے کے پار ہو جانے والے تھے۔ چنانچہ طائف والے تو محروم رہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت اہل یثرب کے لئے لکھ دی۔ وہ مدینہ جہاں آپ خود تشریف بھی نہ لے گئے تھے وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کھڑکی کھل گئی۔ لوگ خود چل کر آئے۔ پہلے سال چھ، دوسرے سال بارہ اور تیسرے سال بہتر (۷۲) لوگ آئے۔ ان میں ۷۰ مرد اور دو عورتیں تھیں۔ اس کے بعد ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور ہجرت کے بعد تصادم کا آغاز ہوا۔ ہجرت اور تصادم کا یہ مرحلہ سیرۃ مطہرہ میں پختگی کے بعد آیا۔ انقلاب برپا کرنے والے لوگ خود پختہ سیرت و کردار کے مالک ہونے چاہئیں۔ وہ صداقت و امانت کے پیکر ہوں گویا اپنی ذات پر نظام خلافت قائم کر چکے ہوں۔ یہ پہلا مرحلہ ہو گا۔ بقول اکبر الٰہ آبادی مرحوم "

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ منظم ہو کر ایک امیر کے حکم پر حرکت کریں۔ بڑھنے کا حکم ہو تو بڑھیں۔ رکنے کا حکم ملے تو وہیں رک جائیں۔ اس کے بعد جا کر کہیں تصادم کا مرحلہ آتا ہے۔

دو طرفہ انقلابی جدوجہد کا اگلا مرحلہ تصادم ہے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ میں یہ دو طرفہ مرحلہ مسلح تصادم کی صورت میں وقوع پذیر ہوا۔ اس مرحلہ کا آغاز ہجرت کے بعد

نبی ﷺ کی طرف سے ہوا۔ مکہ والوں کی طرف سے نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس مرحلے میں مسلح جنگ ہوئی۔ سورۂ توبہ کی آیت کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ جس میں واضح کیا گیا ہے کہ:

﴿إن الله اشترى من المومنين انفسهم واموالهم بان لهم
الجنة يقاتلون في سبيل الله فيقتلون ويقتلون﴾

"اللہ نے ایمان والوں سے ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔
وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔"

یہ گویا دو طرفہ مسلح تصادم ہے۔ جس میں قتل کیا بھی اور قتل ہوئے بھی۔ ہم سیرت طیبہ میں دیکھتے ہیں کہ بدر کی جنگ میں ستر قریشی مارے گئے جبکہ تیرہ صحابیؓ موقع پر شہید ہوئے اور چودھویں صحابی شدید زخمی تھے۔ وہ مدینہ جاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ تاہم غزوہ احد میں معاملہ بالکل برعکس ہو گیا۔ اس غزوہ میں ستر صحابہؓ شہید ہو گئے۔

دور حاضر میں تصادم کا مرحلہ

اب ہمیں غور کرنا ہے کہ دور حاضر میں تصادم کا یہ مرحلہ کیسے آئے گا۔ جہاں تک پہلے مرحلے کا تعلق ہے تو اس کو کسی تبدیلی کے بغیر لے کر چلنا ہے۔ کسی تغیر و تبدل کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ وہ مرحلہ یہ ہے کہ قرآن پڑھو اور پڑھاؤ۔ قرآن کی دعوت کو عام کرو۔ قرآن کے ذریعہ ایمان حاصل کرو اور اسے قلب و ذہن میں گہرے سے گہرا اتارتے چلے جاؤ۔

دوسرا مرحلہ تنظیم کا ہے۔ اس مرحلہ میں صرف اتنا فرق واقع ہو جائے گا امیر کی اطاعت صرف "معروف" میں ہو گی' اس لئے بیعت میں سمع و طاعت کے ساتھ "فی المعروف" کے الفاظ کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

البتہ تیسرے مرحلے کو ہم جوں کا توں نہیں لے سکتے۔ اس لئے کہ اس مرحلے میں ایک بہت بڑی تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ اور اس تبدیلی کا تقاضا یہ ہے کہ اجتہاد سے کام لیا جائے۔

نبی ﷺ کے دور اور آج کے حالات میں فرق

نبی ﷺ کے وقت کے حالات اور آج کے حالات میں زمین و آسمان کا فرق واقع

ہو گیا ہے۔ وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ حضور ﷺ نے ۶۲۲ء میں مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ اس لحاظ اب ۱۴۱۳ برس بیت چکے ہیں (خطبے کے وقت تک) چنانچہ حضور ﷺ اور آج کے حالات میں جو فرق واقع ہو گیا ہے اس کا ادراک ضروری ہے اگر حالات مرور زمانہ کے باوجود جوں کے توں رہتے تو اجتہاد کی کیا ضرورت تھی۔ ایسی صورت میں حضور ﷺ کے منہج کی پیروی جوں کی توں کرنی ہوتی۔

بہر حال میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس وقت کے حالات میں دو تبدیلیاں تو منفی نوعیت کی ہیں۔ جبکہ ایک تبدیلی مثبت اعتبار سے واقع ہوئی ہے۔ ان دونوں قسم کی تبدیلیوں سے ایک نتیجہ نکلتا ہے جس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔

ایک منفی تبدیلی تو یہ ہوئی کہ حضور ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کا واسطہ کھلے کافروں سے تھا۔ جبکہ آج اسلامی تحریکوں کا راستہ روکنے والے کوئی اور نہیں خود مسلمان ہیں[۲۹]۔ نظام خلافت کے برپا ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہی مسلمان ہیں۔ مصر میں حسنی مبارک ----- مسلمانوں کے ساتھ، شام میں حافظ الاسد اخوان کے ساتھ، اسی طرح الجزائر میں مسلمان فوج اسلامی تحریک کے ساتھ جو کچھ کر رہے ہیں وہ سب کے سامنے ہے۔ ہمارے اپنے ملک میں نظام مصطفےٰ کی تحریک پر گولیاں چلانے والے بھی مسلمان ہی تھے۔ گویا حالات میں یہ بہت بڑی تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ آج نظام خلافت کو برپا کرنے کے لئے پہلے ان نام نہاد مسلمانوں سے ٹکر لینا پڑے گی۔ اس کے بعد کہیں جا کر معاملہ کفار کے ساتھ ہو گا۔

حضور ﷺ کے عہد مبارک اور ہمارے دور میں ایک اور تبدیلی یہ واقع ہو گئی ہے کہ آپ کے عہد مبارک میں کوئی باقاعدہ حکومت اور Standing Army نہیں تھی گویا مقابلہ انسانوں کا انسانوں سے تھا۔ تلواروں کا تلواروں سے نیزوں کا نیزوں سے گھوڑوں کا گھوڑوں سے اور اونٹوں کا اونٹوں سے تھا۔ اگر کوئی فرق تھا تو تعداد کا تھا۔ آپ نفری کے فرق کے ساتھ ساتھ اسلحہ کے فرق کو بھی پیش نظر رکھیں تو بھی زیادہ سے زیادہ ایک اور دس کی نسبت بنے گی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ آج معاملہ ہی کچھ اور ہو

کیا ہے۔ اس وقت جو نظام سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ اور ملوکیت پر مبنی موجود ہیں، ان نظاموں کے چلانے والوں کے مفادات ان سے وابستہ ہیں۔ وہ ان نظاموں سے بے پناہ مراعات حاصل کر رہے ہیں۔ ان کی مراعات اور مفادات کے تحفظ کے لئے ان کے پاس مستقل افواج (Standing Armies) موجود ہیں۔ یہ مستقل فوجیں، پیرا ملٹری فورس، پولیس اور ایئر فورس پر مشتمل ہیں۔ یہ مراعات اور مفاد پرست طبقات باغیوں کو کچلنے کے لئے ایئر فورس کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ خود ہمارے ملک کے اندر بلوچستان میں ایئر فورس استعمال کی جا چکی ہے۔ اسی طرح حافظ الاسد نے ایئر فورس کے ذریعے "حمص" کے شہر کو تہس نہس کر دیا تھا جو کہ الاخوان المسلمون کا مرکز بن گیا تھا۔ لہٰذا ان دو منفی تبدیلیوں کی وجہ سے مقابلہ بہت ہی غیر مساویانہ ہو گیا۔

تاہم ان دو منفی تبدیلیوں کے علاوہ ایک مثبت تبدیلی بھی ہوئی ہے۔ وہ مثبت تبدیلی یہ ہے کہ رسالت مآب ﷺ کے ایک ہزار سال بعد تک بھی انسان کا عمرانی شعور اس سطح تک نہیں پہنچا تھا کہ وہ ریاست اور حکومت میں فرق کر سکے۔ آج انسان کا عمرانی شعور یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ وہ ریاست کو الگ شے سمجھتا ہے اور حکومت کو ریاست کا محض ایک عنصر گردانتا ہے۔ حکومت دراصل ریاستی امور کو چلانے کا ایک ادارہ ہے۔ شہریوں کی وفاداری ریاست کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے نہ کہ حکومت کے ساتھ، بلکہ حکومت کو تبدیل کرنا شہریوں کا حق ہے۔ یہ ایک عظیم فرق ہے۔ اس فرق کے اثرات و نتائج کا اچھی طرح ادراک کر لینا ضروری ہے۔

عمرانی ارتقاء سے پیدا ہونے والے اس فرق کو اگر سامنے رکھا جائے تو اب مسلح تصادم کے مرحلہ کا متبادل بھی موجود ہے۔ میں مسلح بغاوت (یعنی خروج) کو حرام ہرگز نہیں سمجھتا۔ امام ابو حنیفہؒ کا فتویٰ موجود ہے کہ یہ جائز ہے۔ اگرچہ انہوں نے اس کے لئے کڑی شرطیں عائد کی ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ طاقت اتنی ہو جائے کہ کامیابی یقینی نظر آنے لگے۔ بحالات موجودہ ان کی یہ شرط پوری ہونا مشکل ہے۔ تاہم اگر یہ شرط پوری ہو جائے تو پھر مسلح بغاوت جائز ہے۔ مختلف ممالک کے حالات میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً کسی پہاڑی ملک میں گوریلا جنگ کامیاب ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارے ملک کے حالات اس طرح

کی گوریلا جنگ کے متحمل نہیں ہیں۔ پاکستان کے حوالے سے یہ چیز تقریباً محال۔ گویا اصولاً مسلح بغاوت حرام نہ ہونے کے باوجود عملاً قابل عمل (Feasible) نہیں ہے۔

حکومت تبدیل کرنے کے دو راستے

اس وقت دنیا میں حکومت تبدیل کرنے کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ انتخابات کا ہے۔ چنانچہ آپ ووٹ کی طاقت سے حکومت تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس کے حوالے سے ہم تفصیلاً بحث کر چکے ہیں کہ اس ذریعے سے چہرے تبدیل کئے جا سکتے ہیں نظام ہرگز نہیں بدلا جا سکتا۔ جبکہ ہمیں چہرے نہیں نظام بدلنے کی ضرورت ہے۔ انتخابات کے انعقاد کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ موجود الوقت نظام کسی طرح زیادہ بہتر انداز میں چلایا جائے۔

دوسرا طریقہ ایجی ٹیشن کا ہے۔ اس طریقے سے کامیابی تب ممکن ہے کہ تیاری مکمل ہو۔ اگر لاکھوں افراد سر پہ کفن باندھ کر نکلنے پہ تیار ہوں تو کامیابی یقینی ہے۔ اسے ہم مظاہراتی طریقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک مظاہرہ تو وہ ہے جسے ہم "خاموش مظاہرہ" کہتے ہیں۔ یہ دراصل ہماری دعوت و تبلیغ ہی کا ایک طریقہ ہے۔ تاہم نظام بدلنے کے لئے جو مظاہرہ ہوتا ہے اس کے ذریعہ تو باطل نظام کو چیلنج کیا جاتا ہے۔ یہ مظاہرہ گھیراؤ کے ساتھ ہوگا کہ اس نظام کو اب چلنے نہیں دیں گے۔ "ترک موالات" کی تحریک بھی اسی کا ایک حصہ ہوگی۔ یعنی اب ہم نظام باطل کو ٹیکس نہیں دیں گے۔ بینکوں کو چلنے نہیں دیں گے اور جاگیرداروں کو ان کا حصہ نہیں دیں گے۔

کوئی انقلابی تحریک جب اس مرحلے میں داخل ہو جائے گی تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ باطل نظام اس کے راستے میں مزاحم ہوگا۔ اب اس جماعت کے کارکنوں پر گولیاں بھی برسائی جائیں گی اور ان کو جیلوں میں ٹھونسا جائے گا۔ لیکن یہ سارا تشدد یکطرفہ ہوگا دو طرفہ نہیں، جبکہ سیرت نبوی میں یہ جنگ دو طرفہ تھی لیکن یہاں اسلامی انقلابی تحریک کے کارکن کسی کو قتل نہیں کریں گے بلکہ خود قتل ہونے کے لئے تیار ہو کر میدان میں آئیں گے۔

نظام کی تبدیلی کے لئے خون

یہ بات ایک سے زائد بار کہی جا چکی ہے کہ رائج الوقت نظام خون دیئے بغیر نہیں بدلتا۔ اگر کوئی یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ دین بھی غالب ہو جائے اور خون کا ایک قطرہ بھی نہ بہے تو یہ محض خام خیالی ہے۔ اگر یہ کام خون دیئے بغیر ہو سکتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لئے کئی سو صحابہؓ کی جانوں کا نذرانہ پیش نہ کرتے' جبکہ ہمارا یقین یہ ہے کہ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ صحابیؓ کی جان ہم جیسے لاکھوں انسانوں کی جان سے زیادہ قیمتی ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت حمزہؓ اور حضرت مصعب بن عمیرؓ جیسے رفقاء کی قربانیاں دی ہیں۔ حضرت حمزہؓ کو آپ نے "اسد اللہ و اسد رسولہ" کا خطاب عطا فرمایا اور حضرت مصعب بن عمیرؓ مدینے میں پہنچنے والے پہلے معلم قرآن ہیں۔ انہی کی محنت سے مدینہ میں انقلاب کے لیے زمین ہموار ہوئی تھی۔

نہی عن المنکر کے تین مدارج

اب میں آپ کے سامنے نہی عن المنکر کے حوالے سے دو احادیث مبارکہ پیش کر رہا ہوں۔ ایک حدیث تو وہی ہے جو میں نے خطبہ کے آغاز میں پڑھی تھی۔ یہ حدیث حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے۔ صحیح مسلم شریف کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا

> من رأى منكم منكرا فليغيره بيده' فإن لم يستطع فبلسانه' فإن لم يستطع فبقلبه' وذلك أضعف الإيمان
>
> "تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ (یعنی طاقت) سے بدل دے اور اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اسے برا کہے اور اسے بدلنے کی کوشش کرے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے دل سے برا جانے' اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔"

گویا اگر برائی سے دلی نفرت بھی نہیں اور اس کو بدلنے کا دل میں ارادہ بھی نہیں تو پھر ایسے شخص کے دل میں ایمان ہی نہیں ہے۔

اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب تک طاقت نہیں ہے "نہی عن المنکر باللسان" کا فریضہ ادا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ہم زبان سے کہتے رہیں گے کہ یہ حرا ہے۔ یہ جاگیرداری' یہ سودی نظام جائز نہیں وغیرہ وغیرہ۔ جب طاقت حاصل ہو جائے گ تب نظام باطل کو میدان میں چیلنج کیا جائے گا یعنی "نہی عن المنکر بالید"۔

یہی مضمون ایک دوسری حدیث مبارکہ میں زیادہ واضح ہو کر آیا ہے۔ اس ک راوی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں اور یہ بھی صحیح مسلم شریف کی روایت ہے:

ما من نبی بعثه الله فی امة قبلی الا کان له من امته حواریون واصحاب یاخذون بسنته ویقتدون بامره' ثم انها تخلف بعدهم خلوف یقولون ما لا یفعلون ویفعلون ما لا یؤمرون' فمن جاهدهم بیده فهو مومن' ومن جاهدهم بلسانه فهو مومن' ومن جاهدهم بقلبه فهو مومن' ولیس وراء ذلک من الایمان حبة خردل

"مجھ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی کسی امت میں اٹھایا تو اس کی امت میں سے اس کے ایسے حواری اور اصحاب ہوتے تھے جو اپنے نبی کی سنت کو تھامے رکھتے اور اس کے حکم کی اطاعت کرتے۔ پھر ان کے بعد ان کے ایسے نالائق جانشین آئے جن کا حال یہ تھا کہ جو کہتے اس پر عمل نہ کرتے اور وہ کام کرتے جن کا ان کو حکم نہیں دیا جاتا۔ تو ایسے لوگوں سے جو شخص ہاتھ (قوت و طاقت) سے جہاد کرے وہ مومن ہے' اور جو شخص ان سے زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو شخص ان سے دل سے جہاد کرے (یعنی دل میں کڑھے) وہ بھی مومن ہے۔ اور اس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔"

یہ ایک بڑی جامع حدیث ہے۔ امتوں کے زوال کا پورا فلسفہ اس میں موجود ہے اس لئے کہ قول و فعل کا تضاد ہی امتوں کو زوال سے دوچار کرتا ہے جیسا کہ آج ہمارا حا ہو گیا ہے کہ ہم دعویٰ کرتے ہیں عشق رسولؐ کا لیکن اتباع رسولؐ سے مکمل گریز ہے البتہ بدعات و خرافات کا ایک طومار ہے کہ جس کو دین بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

نظام خلافت قائم کرنے کی جدوجہد فرض عین ہے

انقلابی جدوجہد کے تمام مراحل کو بیان کر دینے کے بعد مجھے دو باتیں مزید کہنی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ نظام خلافت قائم کرنے کی جدوجہد ہر مسلمان کے لئے فرض عین ہے۔ یہ عین اس کے ایمان کا تقاضا ہے ورنہ مذکورہ بالا حدیث کے مطابق وہ قول و فعل کے تضاد کا مرتکب ہو رہا ہے کہ دعویٰ تو کرتا ہے اللہ پر ایمان کا مگر اللہ کا دین پامال ہوتے دیکھتا ہے اور اپنے کاروبار کو چمکانے میں مشغول ہے۔ اس وقت دین جس قدر مغلوب ہے اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے   اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد   دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

مولانا حالی نے مناجات بحضور ختم المرسلین ﷺ میں عرض کیا ہے:

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے   امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے   پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

ایک طرف دین کی پستی کا یہ عالم ہے، دوسری طرف ہماری بے غیرتی اور بے حسی کی کیفیت یہ ہے کہ بس اپنے کاروبار، اپنی جائیداد اور اپنے معاملات میں پھنسے ہوئے ہیں ہمیں فکر ہے تو اپنی کاروں کے ماڈل کی اور اپنے ٹیلی ویژن کے اسکرین کے سائز کی۔

غلبۂ دین کی جدوجہد کو فرض عین قرار دینے کے سلسلہ میں ایک اور نکتے کا اضافہ کروں گا۔ اور وہ یہ ہے کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں فقط وہیں غلبۂ دین کی جدوجہد فرض عین نہیں ہے بلکہ اگر کہیں صرف ایک ہی مسلمان ہے تو اس پر بھی فرض ہے کہ وہ دین کے غلبے کی جدوجہد کرے۔ اگر اللہ تعالیٰ ساڑھے نو سو برس کی زندگی دے تو اس ساری زندگی میں یہی کام کرتا رہے۔ یہ کام تب بھی کرنا ہے جب کوئی شخص مانے اور تب بھی کرنا ہے جب کوئی شخص نہ مانے۔ قرآن نے ہمارے سامنے حضرت نوح علیہ السلام کی مثال رکھی ہے۔ وہ اللہ کا بندہ ساڑھے نو سو برس استقامت کا پہاڑ بن کر کھڑا رہا ہے مگر اس طویل محنت سے کتنے لوگ ایمان لائے؟ پھر اگر وہ کام چھوڑ کر بیٹھ جاتے تو ناکام قرار

پاتے مگر وہ کام کرتے رہے۔ قوم نہیں مانی تو قوم ناکام ہوتی ہے اور اپنا فرض ادا کرنے کی وجہ سے وہ خود کامیاب رہے۔

سیرت مطہرہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہے کہ کہیں اگر ایک مسلمان بھی ہے تو اس پر بھی دعوت دین اور اقامت دین فرض ہے۔ آپ ﷺ نے جب کام کا آغاز کیا تو آپ تنہا تھے۔ ہمارے لئے اسوۂ کامل حضور ﷺ ہیں' اس لئے کہ قرآن کریم نے کہا ہے ﴿لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة﴾ البتہ ایک بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ آپ نے جو کام تئیس برس کے مختصر عرصے میں انجام دیا اب شاید وہ کئی سو برس میں مکمل ہو۔

چنانچہ دیکھئے' یہ کام برصغیر پاک و ہند میں تقریباً چار سو سال سے انجام دیا جا رہا ہے۔ کام کا آغاز حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوا۔ اس کے بعد دعوت قرآنی امام الہند حضرت شاہ ولی اللہؒ نے شروع کی۔ پھر پچھلی صدی میں جہاد و قتال کا نمونہ سید احمد شہید بریلویؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے دکھایا۔ یہ سارا کام تدریجاً ایک نقطے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ بات میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ مشیت ایزدی میں اس خطے کی کوئی خاص اہمیت ضرور ہے۔ اس لئے کہ ایک ہزار برس تک تمام مجددین ملت عالم عرب میں پیدا ہوئے مگر جونہی الف ثانی (سنہ ہجری کا دوسرا ہزار) کا آغاز ہوا تو مجددیت کا سلسلہ ہندوستان میں شروع ہو گیا۔ گیارھویں صدی کے مجدد شیخ احمد سرہندیؒ ہیں جن کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا:

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر　　وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے　　جس کے نفس گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان　　اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے بعد' حضرت شاہ ولی اللہؒ پیدا ہوئے جو بارھویں صدی کے مجدد ہیں۔ حضرت شاہ صاحب حقیقتاً مجدد علوم اسلامی تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ملت مسلمہ کو پھر سے قرآن کی طرف متوجہ کیا' جبکہ قرآن سے بے اعتنائی اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ اسے صرف حصول ثواب کا ذریعہ سمجھ

لیا گیا تھا۔ یہ حضرت شاہ ولی کی تحریک کا اثر ہے کہ پچھلے تین سو برسوں میں قرآن حکیم پر سب سے زیادہ علمی و فکری کام برعظیم پاک و ہند میں ہی ہوا ہے۔ باقی پوری دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔

میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ نظام خلافت کا قیام اور اقامت دین کا کام تدریجاً ہو گا۔ چنانچہ دیکھئے اس وقت بیسویں صدی میں یہ کام بھرپور اور جامع تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اب اس صدی کی تیسری نسل میں یہ کام ہو رہا ہے اور کام کو اس منزل تک پہنچانے میں بہت سے لوگوں کی محنت شامل ہے۔ آج سے اٹھاسی برس قبل مولانا ابوالکلام آزادؒ ۱۹۱۲ء میں حکومت الٰہیہ کا نعرہ لے کر اس ملک میں کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے بیعت ہی کی بنیاد پر حزب اللہ قائم کی تھی۔ الہلال اور البلاغ کے ذریعے دعوت رجوع الی القرآن کا غلغلہ بلند کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ نوجوان مبلغین قرآن پیدا کرنے کے لئے کلکتے میں دار الارشاد کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا تاکہ فکر قرآنی کو عام کیا جا سکے۔ گویا برعظیم پاکستان و ہند میں بھی یہ جدوجہد کم از کم اسی (۸۰) برس پرانی ہو کر اب تیسری نسل میں داخل ہو چکی ہے۔ جو کام رسول اللہ ﷺ نے ایک (Life span) میں کر دیا تھا وہ اب اگر تین چار نسلوں میں مکمل ہو جائے تب بھی یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جس کام کا آغاز ۱۹۱۲ء میں کیا تھا وہ اس کو جاری نہ رکھ سکے ان کی اس بددلی کے کئی اسباب تھے ان میں سے ایک بڑا سبب قدامت پسند علماء کا اختلاف بھی تھا۔(۳۰)

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جس کام کو چھوڑ دیا تھا اس کا بیڑا دوبارہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اٹھایا۔ مولانا آزاد مرحوم نے حزب اللہ قائم کی تھی جبکہ مولانا مودودی مرحوم نے جماعت اسلامی کی داغ بیل ڈالی۔ اگرچہ ان سے یہ کوتاہی ہو گئی کہ انہوں نے اس کی بنیاد نظام بیعت پر نہ رکھی۔ مولانا آزاد نے ایک ادارہ "دار الارشاد" کے نام سے قائم کیا تھا جبکہ مولانا مودودی مرحوم نے علامہ اقبال کے ایک عقیدت مند کے ذریعے دار الاسلام بنایا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے کام کو سات آٹھ سال ہی جاری رکھ سکے جبکہ مولانا مودودی مرحوم بھی جماعت اسلامی قائم کرنے کے بعد اپنے اصولی انقلابی طریقہ کار پر سات، آٹھ سال ہی کاربند رہ سکے اور پاکستان بننے کے بعد

جماعت اسلامی کو انتخابی سیاست میں الجھا دیا۔ اس طرح وہ ایک اصولی اسلامی انقلابی تحریک کی بجائے محض ایک قومی سیاسی جماعت بن کر رہ گئی اور انتخابی سیاست کی دلدل میں پھنس جانے کے بعد جماعت اسلامی کا انقلابی کردار ختم ہو کر رہ گیا۔

ہمارا کام

جہاں سے مولانا مودودی مرحوم نے کام کو چھوڑا تھا، اب تیسری نسل میں، وہاں سے میں نے اس کام کا آغاز کیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت دعوت قرآنی کے عام کرنے میں لگایا ہے۔ گویا یہ وہی دعوت رجوع الی القرآن ہے، نوجوانوں میں قرآن کے پڑھنے اور پڑھانے کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی کام کے لئے انجمن خدام القرآن کا قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن کے تحت متعدد قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج کا قیام عمل میں آیا ہے۔ قرآن اکیڈمیوں میں دو سالہ اور یک سالہ نصابوں کے ذریعے ایسے نوجوان تیار کئے گئے جو اس قرآنی فکر کو عام کر سکیں۔ اس کے علاوہ انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام قرآن کانفرنسیں قرآنی تربیت گاہیں اور محاضرات قرآنی کا انعقاد مختلف شہروں میں ہو رہا ہے۔

تحدیث نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ اس پیغام کو نجانے کہاں کہاں لے کر پھرا ہوں۔ اس سارے پس منظر کو بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ کام آج ہم نے نہیں شروع کیا ہے بلکہ یہ ایک مسلسل عمل کا حصہ ہے۔ دعوت رجوع الی القرآن کا جو کام امام الہند شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے شروع کیا تھا وہی کام مختلف نسلوں سے ہوتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔

ہمارے پروگرام تین اجزاء

دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے اس کام کے تین حصے ہیں :

(۱) ہمارے اس کام کی جڑ اور بنیاد دعوت رجوع الی القرآن ہے۔ جسے میں نے انقلابی جدوجہد کے پہلے مرحلے "دعوت ایمان بذریعہ قرآن" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کام

کے لئے انجمن خدام القرآن قائم ہے۔ اور اس کے کام کی وسعت کی ایک جھلک میں ابھی بیان کر چکا ہوں۔ ہم اپنے مختلف نصابوں اور تربیتی پروگراموں کے ذریعہ ایسے نوجوان پیدا کرنا چاہتے ہیں جو قرآن کو براہ راست پڑھ اور سمجھ سکیں۔ اور بقول اقبال نزول کتاب ان کے دلوں پر ہونے لگے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی [۳۱] نہ صاحب کشاف [۳۲]

قرآن حکیم کو ترجموں اور تفسیروں سے نہیں بلکہ براہ راست سمجھا جائے گویا کہ قرآن آپ کے قلب پر نازل ہو رہا ہے۔ [۳۳]

(۲) دوسرا کام ہم یہ کر رہے ہیں کہ تنظیم اسلامی کے نام سے ایک اصولی انقلابی جماعت کا قیام عمل میں آجائے۔ تاکہ وہ لوگ جن کے دل نور قرآنی سے روشن ہو جائیں وہ اقامت دین کے لئے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کر لیں۔ تنظیم اسلامی سمع و طاعت فی المعروف کی بیعت پر قائم ہے۔ اقدام کا مرحلہ جب بھی آئے گا وہ تنظیم کے تحت ہی ہوگا۔ کیونکہ یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ لوگ جمع ہو جائیں جو اپنے اوپر اور اپنے دائرہ اختیار میں دین کا نفاذ کر چکے ہوں اور مل جل کر بنیان مرصوص بن چکے ہوں۔ اس تنظیم کی حیثیت درخت کے تنے جیسی ہے جبکہ تحریک رجوع الی القرآن درخت کی جڑوں کی مانند ہے [۳۴] درخت کو ساری غذا جڑوں سے آتی ہے اور تنے سے گذر کر اوپر تک پہنچتی ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ ہم تنظیم اسلامی کے نام سے ایک اصولی انقلابی جماعت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارا دعوٰی یہ نہیں ہے کہ ہم وہ جماعت بنا چکے ہیں۔ کیونکہ بحالات موجودہ ویسی جماعت بنانا بہت مشکل کام ہے۔ ہمارے اذہان ہنوز انگریز کی غلامی سے آزاد نہیں ہوئے۔ ہماری غیرت و حمیت نکل جا چکی ہے۔ ہمارے اخلاق کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔ ہم لوگ وعدے کرتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں سمع و طاعت کی بنیاد پر جماعت بنانا آسان کام نہیں ہے۔

(۳) ہمارے کام کی تیسری سطح یہ ہے کہ نظام خلافت کے اجتماعی ڈھانچے اور اس کی

برکات کو عام کیا جائے۔ یہ کام ہم تحریک خلافت پاکستان کے نام سے کر رہے ہیں۔ یہ دراصل عوام کو educate کرنے کا کام ہے۔ اس کام کے بھی دو پہلو ہیں ایک عوامی سطح پر نظام خلافت کی برکات کے شعور کو عام کرنا۔ چنانچہ عوام کو نظام خلافت کی برکات سے آگاہ کرنے کے لئے تحریک خلافت کے پلیٹ فارم سے جلسہ ہائے عام اور کارنر میٹنگوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ تحریک خلافت کے پیش نظر کوئی فوری ہنگامہ ہرگز نہیں ہے۔ دوسری سطح نظام خلافت کے اجتماعی نظام اور درپیش جدید مسائل کو علمی انداز میں تعلیم یافتہ طبقے تک پہنچانا ہے۔ یہی دوسرا کام ہے جس کے لئے خطبات خلافت کا انعقاد ملک کے تمام بڑے شہروں میں کیا گیا ہے۔ یہ بہت اہم کام ہے۔ کیونکہ اسلام کا نعرہ لگانا تو آسان ہے لیکن جدید دستوری اور معاشی مسائل سے پنجہ آزمائی کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

تحریک خلافت میں شمولیت کے لئے ہم نے بیعت کی شرط نہیں رکھی۔ اس میں شمولیت ایک طرح کی معاونت ہے، قرآن مجید کے الفاظ میں "تعاونوا علی البر والتقوی"۔ اگر آپ کو اس کام سے اتفاق ہے تو ایک فارم کے ذریعہ آپ تحریک خلافت کے معاون بن جائیں۔ یہ آپ کی طرف سے معاونت کا ایک وعدہ ہے۔ ظاہر ہے اس کام کے لئے آپ اپنا کچھ وقت اور صلاحیت بھی خرچ کریں گے۔ تحریک خلافت کے معاون بننے کے بعد آپ ہمیں اور ہمارے کام کو زیادہ قریب سے دیکھ سکیں گے۔ اس سے باہمی اعتماد میں اضافہ ہو گا۔ یہ اعتماد اور جذبہ آپ کو بالآخر تنظیم اسلامی میں لے آئے گا۔ یہ بات اچھی سمجھ لینی چاہئے کہ اصل شے جس کو مضبوط کرنا ہے وہ تنظیم اسلامی ہی ہے۔

من انصاری الی اللہ؟

میں خطبات خلافت کا اختتام اس پکار پر کرنا چاہتا ہوں کہ "من انصاری الی اللہ؟" یعنی کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟ --- میری مدد کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ تنہائی میں میرے لئے دعا کریں۔ میرے ساتھ تعاون کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ آپ انجمن خدام القرآن سے وابستہ ہو جائیں میرے ساتھ تعاون کی ایک صورت یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ نوجوان اپنی زندگی کا ایک سال فارغ کر کے ایک سالہ رجوع الی القرآن

کے کورس میں شامل ہو جائیں اور قرآن حکیم کے علوم و معارف کو سمجھنے کی کوشش کریں میرے ساتھ تعاون کی بلند ترین سطح یہ ہے کہ آپ تنظیم اسلامی میں شامل ہو میرے اعوان و انصار اور دست و بازو بن جائیں۔ البتہ یہ بات میں ضرور کہوں گا کہ تنظیم اسلامی میں شامل ہونے سے پہلے میرے اوپر پورا اعتماد حاصل کر لیجئے۔ تنظیم میں شمولیت علیٰ وجہ البصیرت ہونی چاہئے' کسی وقتی ترنگ کی بنیاد پر نہیں۔

میرے ساتھ تعاون کا تیسرا اور کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آپ تحریک خلافت کے معاون بنیں۔ جن لوگوں نے چار دن مسلسل خطبات کے لئے روزانہ چار گھنٹے نکالے ہیں اس کا کچھ نہ کچھ عملی نتیجہ بھی ضرور نکلنا چاہئے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم
ولسائر المسلمین والمسلمات

☆ ☆ ☆

حواشی

(۱) میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ان بنیادی مباحث پر مجھے سیر حاصل بحث اور گفتگو کی توفیق ملی اور "خطبات خلافت" اپنے تکمیلی مرحلے تک پہنچ گئے۔ یہ جو کچھ ہوا ہے سب اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوا ہے اس کائنات میں ایک پتہ بھی اس کے اذن کے بغیر جنبش نہیں کر سکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ حالات کو سازگار اور موافق نہ بنا دیتا تو ہم کچھ بھی نہ کر سکتے۔ اس موقع پر اکبر الہ آبادی مرحوم کے دو شعر مجھے یاد آتے ہیں

یہ عزم ترا کسی سے دمساز ہو کیونکر
اسباب نہ ہوں جمع تو آغاز ہو کیونکر
اسباب کرے جمع خدا ہی کا ہے یہ کام
طالب ہو خدا سے تو دعا ہی کا ہے یہ کام

(۲) جیسا کہ گزشتہ مباحث میں بتایا جا چکا ہے کہ نبی ﷺ نے صریح پیشگوئی فرمائی ہے کہ قیامت سے قبل اس دنیا میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام قائم ہو گا۔ اور یہ قیام ہو گا بھی عالمی سطح پر (دنیا کے کسی محدود خطے میں نہیں) البتہ اس نظام کا قیام کس وقت ہو گا؟ اس سوال کا جواب آنحضرت ﷺ نے نہیں دیا۔ اس لئے ہم بھی وقت کا تعین نہیں کر سکتے تاہم اللہ کے رسول ؐ نے جو آثار و علامات بیان فرمائی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ زیادہ دور کی

بات نہیں ہے۔ حضور ﷺ کے بیان کردہ حالات واقعات تیز رفتار زمانے کے طرح یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہو رہے ہیں اور ان واقعات کے پے بہ پے ظہور سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے جو خوشخبری دی ہے اس کی تکمیل کا وقت بہت قریب ہے۔

(۳) خواہش یا عربی میں "امنیہ" اس طلب کو کہتے جس کے پیچھے اس کے مطابق عمل نہ ہو۔

(۳) اگرچہ یہ اپنی جگہ بہت بڑی حقیقت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کا آپ مطالعہ کریں تو وہاں معجزات کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے برعکس آپ ﷺ نے جو انقلاب برپا کیا وہ محنت اور مشقت جھیل کر کیا ہے۔ اس طرح گویا امت کے لئے معجزات کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔

(۵) "قنوت نازلہ" نماز فجر کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد پڑھی جانے والی دعا جو کسی بڑی ہنگامی مصیبت کو دور کرنے کے لئے اور دشمنان اسلام و مسلمین کو ناکام کرنے کے لئے پڑھنا مسنون ہے۔

(۶) قبولیت دعا کے لازمی شرائط درج ذیل ہیں :

(i) دعا پورے یقین، ایمان اور اخلاص کے ساتھ کی جائے۔

(ii) بندہ یا تو کلی طور پر بے بس ہو یا مطلوب شئی کے حصول کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں اور وسائل لگا چکا ہو۔

(iii) دعا حقوق اللہ اور حقوق العباد کے خلاف نہ ہو۔

(iv) عذاب کا فیصلہ ہو چکنے کے بعد عذاب ٹالنے کی دعا نہ ہو (صرف حضرت یونس علیہ السلام کی قوم اس سے مستثنیٰ قرار پائی۔

ان شرائط کے ساتھ جو دعا بھی کی جاتی ہے۔ وہ درج ذیل تین صورتوں میں سے کسی نہ کسی ایک صورت میں لازماً قبول ہوتی ہے۔

(الف) بندہ جو کچھ مانگ رہا ہے وہی اسے عطا کر دیا جائے۔

(ب) اس سے بہتر یا اس کے مساوی کوئی شئی بندے کو عطا کر دی جائے۔

(ج) "دعا" اگر کلی مصلحت کے خلاف ہو اور قبول نہ کی جا سکتی ہو تو اس کو بندے کے اعمال نامے میں درج کر کے روز جزا میں اس کا اجر دینے کے لئے محفوظ کر دیا جائے۔

(۷) عوام اسی حقیقت کا اظہار عوامی پیرایہ میں یوں کیا کرتے ہیں۔

"اللہ نے چار کتابیں اتاریں اور پانچواں اتارا "ڈنڈا" اور علامہ اقبال اپنے انداز میں کہا ہے۔

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

(۸) اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی پیش نظر رہے۔ "اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کا مال جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔

(۹) اس قسم کی جملہ کارروائیاں اسلام کے احکام اور قتال کے جواز کی شرائط اور حدود کے بھی خلاف ہیں۔ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

(۱۰) الجزائر میں ایجیٹیشن کے ذریعہ تحریک کی کامیابی سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ نہ پاکستان کے معاملے کو الجزائر پر قیاس کرنا چاہئے۔ کیونکہ الجزائر میں آزادی کے بعد سوشلسٹ نظام قائم ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں جاگیرداری کا مکمل خاتمہ ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہاں وہ رکاوٹ موجود ہی نہیں ہے جو پاکستان میں پہاڑ بنی کھڑی ہے۔

(۱۱) اسلامی تحریکوں کو ناکام بنانے کے لئے یہ بھی ایک سازش کے تحت ہوتا ہے۔ اسلامی تحریک کو اس کے اصل طریقہ کار سے ہٹانے کے لئے اس پر تشدد کیا جاتا ہے تاکہ اس کے رد عمل میں تحریک بھی تشدد کا راستہ اپنائے اور اس تشدد کو بہانہ بنا کر ریاستی طاقت کے ذریعہ تحریک کو کچل کر رکھ دیا جائے۔

(۱۲) اس طرح کی مسلح جدوجہد میں بھی شرعی احکام کی سختی کے ساتھ پابندی ہونی چاہئے۔ مثلاً یہ کہ ان کارروائیوں کی ذمہ داری یا اختیار امیر کے ہاتھ میں ہو اور غیر مسلح لوگوں یا شہریوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

(۱۳) بالترتیب حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علی ابن ابی طالبؓ کرم اللہ وجہہ

(۱۴) یہی وجہ ہے کہ میں نے سورۂ حجرات کی ان آیات کا درس کئی بار دیا ہے جن میں "ایمان" اور "اسلام" کو دو علیحدہ علیحدہ حقیقتیں قرار دیا گیا ہے۔ تاکہ یہ مغالطہ رفع ہو جائے کہ ہم "فی الواقع مومن ہیں" حقیقت یہ ہے کہ ہم مومن نہیں ہیں۔ بس ہمارے پاس ایک موروثی عقیدہ ہے۔ ایمان تو ایک بہت بڑی طاقت اور نور ہے۔ دل میں حقیقی ایمان ہو اور عمل میں "جہاد" نہ ہو' ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔ درحقیقت ایمان کسی اور شے کا نام ہے اور اسلام کسی اور شے کا نام! چنانچہ حجرات کی آیت (۱۴) میں ہے یعنی یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ اے نبی ﷺ ان سے کہہ دیں کہ تم ایمان ہرگز نہیں لائے ہو' ہاں یوں کہو کہ ہم نے اسلام (فرماں برداری) کو اختیار کر لیا ہے۔ ایمان تو تمہارے دلوں میں اب تک داخل ہی نہیں ہوا ہے۔

(۱۵) مسلم امت کے اندر بصیرت کی موجودگی پر حضرت عمرؓ کی جانب سے اللہ کا شکر ادا کرنے کا

مشہور واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار آپ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو تم کیا کرو گے؟ سامعین میں سے ایک نے تلوار پر ہاتھ رکھ کر کہا "ہم تم کو اس سے سیدھا کر دیں گے" تب حضرت عمرؓ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ جس قوم کی قیادت وہ کر رہے ہیں وہ قوم صاحب بصیرت ہے' اندھوں اور بہروں پر مشتمل نہیں۔

(۱۶) اس ضمن میں بہت سی باتیں باہر سے آ کر شامل کر دی گئی ہیں۔ ورنہ حضور ﷺ کا "سلوک" کل کا کل قرآن ہی کے ذریعہ تھا۔

(۱۷) انسان کا باطن کس طرح شیطان کی زد میں ہے اس کا پتہ ایک حدیث مبارکہ سے چلتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم (یعنی شیطان انسان کے وجود میں خون کی طرح سرایت کئے ہوئے ہے) علامہ اقبال نے اسی بات کو یوں بیان کیا ہے ۔

کشتن ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماق دل است

یعنی ابلیس کو مارنا سخت مشکل ہے کیونکہ وہ دل کی گہرائیوں میں گھسا ہوا ہے۔

ایک دوسری حدیث مبارکہ میں واضح کر دیا گیا ہے۔ اس "شیطان" کو مسلمان بنایا جا سکتا ہے۔ حدیث اس طرح پر ہے کہ ایک بار آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے۔" اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ان صحابی کو جنہوں نے بڑی ہمت کر کے پوچھ لیا "کیا حضور آپ کے ساتھ بھی کوئی شیطان ہے؟" اس سوال کے جواب سے ہمیں یہ قیمتی نکتہ ملا کہ "ہاں مگر میں نے اسے مسلمان بنا لیا ہے"۔ یہی بات اقبال نے اپنے انداز میں اس طرح کہی ہے ۔

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی

(اس شیطان کو مارنے سے زیادہ بہتر یہ ہو گا کہ اس کو مسلمان بنا دو اور قرآن کی تلوار سے اسے مار دو کیونکہ یہ قرآن ہی ہے جو انسان کی رگ رگ میں سما جاتا ہے۔ اور شیطان خون کے جس جس خلئے میں پہنچتا ہے وہاں قرآن بھی پہنچ کر اسے مسلمان بناتا ہے)۔

قرآن کے اسی وصف کو اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے ۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

یعنی جب قرآن روح میں اتر جاتا ہے تو وہ روح ایک دوسری روح بن جاتی ہے اور جب روح دوسری ہو جائے تو عالم بھی بدل کر دوسرا ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید جب کسی کے اندر سرایت

کرتا ہے تو انقلاب عظیم برپا کر دیتا ہے۔ اس کا فکر ہی بدل کر رہ جاتا ہے۔ پہلے زندگی سب سے زیادہ قیمتی شے نظر آتی تھی مگر اب شہادت کی موت سب سے قیمتی شے نظر آنے لگتی ہے۔ حضرت خالد بن ولید ؓ نے یہی بات دشمن کی فوج کو کہلا بھیجی تھی کہ میرے ساتھ وہ لوگ ہیں جن کو موت اتنی ہی عزیز ہے جتنی تمہیں زندگی عزیز ہے۔ تم ان لوگوں کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہو۔ بقول علامہ اقبال ؒ

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

زندگی اور موت کے بارے میں جن کا نقطہ نظر یہ ہو انہیں بھلا کس بات کا خوف ہو سکتا ہے 11 یہی وجہ ہے کہ غزوہ موتہ کے موقعہ پر تین ہزار صحابہ نے ایک لاکھ کی فوج سے اور بعض روایات کے مطابق ہرقل اپنی ایک لاکھ کے ساتھ جب آملا تو تین ہزار کا مقابلہ دو لاکھ کی منظم فوج سے ہوا۔ صحابہ ؓ نے اس سنگین صورت حال پر جب غور کیا تو فیصلہ یہی ہوا کہ ہم تو شہادت کی تمنا میں یہاں آئے ہیں' فتح حاصل کرنا ہمارا مقصود نہیں ہے۔ اسی جنگ میں حضرت جعفر طیار ؓ شہید ہوئے۔ یہ ہے وہ اندر کا انقلاب جو قرآن کے ذریعہ برپا ہوا تھا۔

{۱۸} یہ بات نوٹ کر لینی چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جن کو مردان کار نہیں ملے وہ انقلاب برپا نہیں کر سکے۔ ظاہر بات ہے کہ ناکام وہ انبیاء نہیں ہوئے بلکہ ان کی قومیں ناکام ہو گئیں۔

{۱۹} آیت ۱۲۹ اور آیت ۱۵۱ (سورۃ بقرہ)

{۲۰} بچپن میں ہم نے اور آپ نے یہ کہانی پڑھ رکھی ہے کہ ایک باپ نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی تھی اور ان سے کہا تھا کہ لکڑیوں کے اس گٹھے کو توڑو مگر بیٹوں میں سے کوئی بھی اس کام کو نہ کر سکا۔ مگر گٹھے کو کھول کر جب لکڑیاں الگ الگ کر دی گئیں تو بیٹوں نے بڑی آسانی سے ایک ایک لکڑی کو الگ الگ توڑ دیا۔ اس موقع پر باپ نے نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو اگر تم جمع رہے تو تم کو کوئی نہ توڑ سکے گا۔ لیکن تمہارے درمیان اگر تفرقہ پیدا ہوا تو تمہیں علیحدہ علیحدہ ہر کوئی آسانی سے زیر کر لے گا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے ایک اکیلا اور دو گیارہ بن جاتے ہیں۔

{۲۱} روایت کے مذکورہ بالا الفاظ محض تاکید مزید کے لئے ہیں' اس لئے اگر ان باتوں کا حکم خود آنحضرت ﷺ اپنی طرف سے بھی دیتے تو وہ بھی اللہ کی طرف سے ہی ہوتا کیونکہ قرآن کہتا ہے ﴿وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ﴾ (وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے وہ تو وحی ہے (ان پر) نازل کی جاتی ہے) (النجم : ۳-۴)

{۲۲} مجھے اس موقعہ پر مڈل میں پڑھی ہوئی انگریزی نظم "چارج آف لائٹ بریگیڈ"۲

ایک شعر یاد آرہا ہے۔

Their s not to reason why?
Their s but to do and die!

بحث بازی کا یہ موقع نہیں کہ کیوں اور کیوں نہیں (وقت کا تقاضا صرف یہ ہے) کہ (حکم پر) عمل کرو اور (تعمیل میں) جان دے دو۔

{۲۳} انقلابی جماعت کے تین لازمی اوصاف ہیں (۱) وہ جماعت بالکل نئی ہو۔ (۲) اس جماعت میں شمولیت کے لئے اس کے نظریہ کو شعوری طور پر قبول کرنا ضروری ہو' پھر شمولیت اختیار کرنے کے بعد انسان اس نظریہ کے لئے جان کی بازی تک کھیل جانے کے لئے آمادہ ہو (۳) اور انقلابی جماعت کی تیسری خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ اس کے "اوزان" بالکل نئے ہوں۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ جو کسی حوالے سے پہلے سے کسی معاشرے میں اونچا ہو وہ اس جماعت میں بھی اونچا ہی رہے۔ مثلاً معاشرے میں سید اونچا ہے لہٰذا وہ اس جماعت میں بھی اونچا متصور ہو اور "مصلی" نیچ ہے لہٰذا وہ اس جماعت میں بھی نیچا ہی سمجھا جائے۔ اگر ایسا ہے تو وہ انقلابی جماعت نہیں ہے۔ اس کے برعکس انقلابی جماعت میں جس کی جتنی زیادہ قربانی ہے۔ وہ اتنا ہی بلند ہے اس انقلابی نظریہ کے ساتھ اس کی وابستگی اور قربانی ہی کسی کا مقام متعین کرنے کی بنیاد بنے گی)

{۲۴} سورۃ فتح کی آیت ۱۸ میں بھی بیعت کا ذکر ہے اور اس بیعت پر اللہ کی رضامندی کا اظہار ہے۔ اسی طرح سورۃ ممتحنہ کی آیت ۱۲ میں خواتین کی بیعت کرنے کا ذکر ہے اور اللہ کے رسولؐ کو ان خواتین سے بیعت لینے کی ہدایت ہے۔

{۲۵} میں تو بات سمجھانے کے لئے کیا کرتا ہوں کہ سچی نبوت کی عظمت و قوت کیا ہوگی اس کا تو شاید ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جھوٹی نبوت میں اتنی طاقت ہے کہ قادیانی جماعت کا نظم آج تک قائم ہے۔ اس لئے کہ جس نے بھی کسی کو نبی مان لیا اس کو تو اس کی اطاعت کرنی ہی ہے وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تب مانوں گا جب آپ مجھے اپنا حکم سمجھا دو گے۔ یہ بات کسی ایسے شخص سے تو کہی جا سکتی ہے کہ جس نے نبوت کا دعویٰ نہ کیا ہو اسی طرح اگر آپ کسی کا دعویٰ نبوت قبول نہیں کرتے تو اس سے دلیل کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ لیکن جس کی نبوت پر آپ ایمان لے آئے اس کا تو فرمان ہی دلیل ہے۔ قرآن کہتا ہے وما اتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا (رسول تم کو جو کچھ دیں اسے لے لو اور جس چیز سے تم کو منع کر دیں اس سے رک جاؤ) اب تو دجال ہی نبوت کا دعویٰ کریں گے۔ ایک دجال "مسیلمہ کذاب" بالکل ابتدائی دور میں بھی پیدا ہو گیا تھا اس کے بعد کوئی دجال ایران میں پیدا ہو گیا۔ تو کوئی ہندوستان میں شاید کوئی اور بھی دجال پیدا ہو جائے۔ وہ المسیح الدجال تو خروج کرے گا ہی

احادیث میں جس کی خبر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے دجال بھی پیدا ہو سکتے ہیں لیکن نبی اب بہرحال کوئی نہیں آئے گا۔

{۲۶} حضرت زید بن حارثہؓ کو آزاد کرنے کے بعد نبی ﷺ نے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ تاہم جاہلی روایات کے برخلاف اللہ تعالیٰ نے منہ بولے بیٹے کو صلبی بیٹے کا درجہ اور قانونی حقوق دینے کی ممانعت فرما دی تھی۔

{۲۷} روایات میں ہے کہ بعض حضرات نے اس پر اعتراض بھی کیا مگر نبی ﷺ نے ان کے اعتراض کو سختی کے ساتھ مسترد فرما دیا۔ نبی ﷺ کی وفات کے بعد جب اس لشکر کی روانگی کا وقت آیا تو حضرت ابوبکرؓ نے اپنے اور حضرت عمرؓ کے لئے لشکر میں عدم شمولیت کی اجازت باقاعدہ حضرت اسامہؓ سے حاصل کی کہ ہم دونوں اب کل نظام کے چلانے میں مصروف ہوں گے۔ نیز حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسامہؓ کو گھوڑے پر سوار کر کے اور خود پیدل چل کر لشکر کو رخصت کیا۔

{۲۸} "ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے"۔ یہی فتنہ آج انکار سنت کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ حدیث وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں "بس اللہ کی کتاب ہی کافی ہے۔

{۲۹} فلسطین میں اسرائیل نے P.L.O. کے ساتھ مصالحت اس لئے کی ہے کہ مسلمان مسلمان کو قتل کرے۔ یہودی یہ کام کیوں کریں' یہودی قتل کریں گے تو ان کے قتل ہونے کا بھی خطرہ رہے گا۔ اسی لئے منصوبہ یہ بنایا گیا کہ ان کی چھوٹی سی حکومت محدود اختیارات کے ساتھ بنا دو تاکہ یاسر عرفات فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ وہی کچھ کریں جو حسنی مبارک مصری مسلمانوں کے ساتھ کر رہا ہے۔

{۳۰} انہوں نے اس کام کو چھوڑ کر اپنی توانائیاں جہاد حریت میں کھپانی شروع کر دیں اور کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔ یہ بات میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس ابوالکلام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میری دلچسپی ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے ابوالکلام سے ہے۔

{۳۱} امام فخر الدین رازیؒ (۱۱۴۹ء—۱۲۰۹ء) محدث' فقیہ اور فلسفی مشہور تفسیر "التفسیر الکبیر" کے مصنف ہیں۔

{۳۲} جار اللہ زمخشری (۱۰۷۵ء - ۱۱۴۳ء) لغت' نحو' بلاغت اور تفسیر کے امام معتزلی مسلک رکھتے تھا کشاف من حقائق التنزیل ان کی مشہور تفسیر ہے۔

{۳۳} یہاں ایک بات ان لوگوں سے کہوں گا جنہوں نے دنیوی علوم و فنون تو سیکھ لئے لیکن اتنی عربی زبان نہیں سیکھی کہ قرآن کو براہ راست سمجھ سکیں۔ وہ سوچیں کہ اللہ کے حضور کیا

جواب دیں گے حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق حاسبوا قبل ان تحاسبوا (محاسبے سے پہلے اپنا احتساب خود کر لو) بقول علامہ اقبال مرحوم

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے

{۳۳} نصِ قرآنی میں بھی کام کے ان تین حصوں کا ذکر شجرِ طیبہ کے تین حصوں کی صورت میں موجود ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے: الم تر کیف ضرب اللہ مثلا کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء

درخت کی ایک جڑ ہوتی ہے' ایک تنا ہوتا ہے اور پھر شاخیں ہوتی ہیں جو پھیل جاتی ہیں۔ درخت کی یہ مثال ایک حدیث مبارکہ میں بھی آئی ہے جو حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "اے معاذ! اگر تم چاہو تو میں دین کے عملوں میں سے چوٹی کا عمل اور اس کی جڑ تمہیں بتا دوں"۔ انہوں نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں ضرور ارشاد فرمایئے! آپؐ نے فرمایا "جڑ کا عمل تو یہ ہے کہ تو یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے' وہ اکیلا ہے' اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور جس عمل سے دین کی گرفت مضبوط رہتی ہے وہ نماز ادا کرنا اور زکوۃ دینا ہے (یعنی نظم جماعت) اور اس کا چوٹی عمل کا عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے"۔